آدم اسمتھ
ایک تعارف

مصنف: ایمن بٹلر

آدم اسمتھ۔ ایک تعارف

مصنف: ایمن بٹلر

Adam Smith - A Primer by Eamonn Butler

Institute of Economic Affairs

کتاب: آدم اسمتھ۔ایک تعارف

مصنف: ایمن بٹلر

مترجم: سید علی احسان

اشاعت: اپریل2026

تعداد: 100

ISBN: 969-9824-27-2

ناشر: پرائم انسٹیٹیوٹ

پتہ: مکان نمبر1، گلی نمبر58، F-7/4، اسلام آباد، 44000، پاکستان

فہرست

مصنف کا تعارف _____ 1

دیباچہ _____ 2

تشکر _____ 6

خلاصہ _____ 7

تعارف _____ 9

۱۔آدم اسمتھ کی اہمیت _____ 16

۲۔اسمتھ کی زندگی اور پیشہ ورانہ سفر _____ 23

۳۔دی ویلتھ آف نیشنز _____ 29

۴۔دی تھیوری آف مارل سنٹیمنٹس _____ 65

۵۔اسمتھ کے لیکچرز اور دیگر تحریریں _____ 78

۶۔غیر مرئی ہاتھ پر ایک ضمنی بحث _____ 89

۷۔آدم اسمتھ کے منتخب اقتباسات _____ 95

منتخب کتب نامہ _____ 105

اسمتھ کی تصانیف کے دیگر ایڈیشن _____ 106

اسمتھ اور اس کے کام پر کتب _____ 106

اسمتھ اور اس کے کام پر مضامین _____ 107

تبصرہ: آدم اسمتھ کی معنویت _____ 108

مصنف کا تعارف

ڈاکٹر ایمن بٹلر ایڈم اسمتھ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ہیں—یہ ایک بااثر تھنک ٹینک ہے جس نے ضروری خدمات کی فراہمی میں انتخاب اور مسابقت کو فروغ دینے کے لیے پالیسیاں ترتیب دی ہیں۔اُن کے پاس معاشیات، فلسفہ اور نفسیات میں ڈگریاں ہیں، اور انہوں نے 1978 میں یونیورسٹی آف سینٹ اینڈریوز سے پی ایچ ڈی حاصل کی۔ 1970 کی دہائی کے دوران انہوں نے واشنگٹن ڈی سی میں امریکی ایوانِ نمائندگان کے لیے پنشن اور فلاح و بہبود سے متعلق امور پر بھی کام کیا۔

برطانیہ واپس آکر انہوں نے برٹش اِنشورنس بروکر کے ایڈیٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں، اس کے بعد انہوں نے مکمل طور پر ایڈم اسمتھ انسٹی ٹیوٹ کے لیے خود کو وقف کر دیا، جس کے قیام میں انہوں نے مدد کی۔ ڈاکٹر بٹلر معاشی نظریے اور عملی اطلاق پر متعدد کتابوں اور مضامین کے مصنف ہیں، اور ذہانت اور آئی کیو ٹیسٹنگ پر چند کتابوں کے شریک مصنف بھی ہیں۔

دیباچہ

اگر آدم اسمتھ سے پوچھا جاتا کہ جس انداز پر پاکستان کی معیشت کو چلایا جارہا ہے، وہ کس عہد سے تعلق رکھتا ہے، تو اسمتھ کا فوری جواب ہوتا کہ اٹھارہویں صدی کا انگلستان کی طرز پر۔ اسمتھ کی اس تشخیص کا پاکستانی مفہوم یہ ہے کہ پاکستان کے سیاست دان، معیشت دان اور تکنیک دان پاکستان کی معیشت کو اصل میں ایک ریاستی معیشت سمجھ کر چلا رہے ہیں۔ بلکہ انھوں نے پاکستان کی معیشت کو ایک ریاستی معیشت میں ڈھالنے کی کوششوں میں معیشت کو مسلسل بحران کا شکار کر رکھا ہے۔ ریاستی معیشت کو جن ستونوں پر استوار کرنے کا جتن کیا گیا اور کیا جارہا ہے، ان میں اسمتھ کے وقت کی معاشی تحفظ پسندی اور بجائے زر پسندی کے ٹیکس پسندی شامل ہیں۔

اسمتھ کی ''دولتِ اقوام'' کا مطالعہ کریں اور بالخصوص پاکستان کی معیشت کو پیشِ نظر رکھیں، تو اسمتھ کی تازگی اور آج کے دور کے ضمن میں اس کی موزونیت کی تفہیم آسان ہو جاتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اسمتھ پاکستان کی معیشت کو ایک مثال کے طور پر سامنے رکھتے ہوئے، ریاستی معیشت کے تصور کو تنقید کا نشانہ بنارہا ہے، اور ایک نمونے کے طور پر اس کے سامنے جو معیشت ہے، وہ شہری معیشت ہے (یعنی خود اس شہر کی معیشت جہاں اس کی پیدائش ہوئی)۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسمتھ کو پڑھنا، سمجھنا، اسمتھ پر لکھنا، بولنا، اسمتھ کا اردو یا کسی اور زبان یا مقامی زبان میں ترجمہ کرنا، یا اسمتھ کے خیالات کو پھیلانا بالخصوص پاکستان کی ریاستی معیشت اور بالعموم ریاستی معیشت کی مہلک خامیوں کا پردہ چاک کرنے کے مترادف ہے۔ یہاں ایک مختصر موازنہ ضروری ہے۔ اسمتھ آزاد تجارت کی وکالت کرتا ہے۔ جبکہ پاکستان کے ریاستی معیشت دان، جن میں سیاست دان بھی شامل ہیں، محدود اور محفوظ تجارت پر عمل پیرا ہیں۔ اسمتھ آزاد تجارت کو خوشحالی کا سرچشمہ قرار دیتا ہے، جبکہ ریاستی معیشت دان اسے ریاست کے پروردہ کاروباریوں کی خوشحالی کے لیے نقصان دہ سمجھتے ہیں۔

اسمتھ پیداوار کو افراد کے ساتھ جوڑتا ہے، جبکہ ریاستی معیشت دان اسے ریاست کا وظیفہ قرار دیتے ہیں۔ اسمتھ محنت کی تقسیم اور تخصیص کو پیداوار کے لیے ایک مہمیز کار گردانتا ہے، جبکہ ریاستی معیشت دانوں کے نزدیک یہ دونوں عوامل، ریاست اور ریاست کے پروردہ کاروباروں کو کمزور کرنے کا سبب ہیں۔ اسمتھ اشیا کی قیمتوں کے آزاد تعین کو معیشت کی فطرت پر قیاس کرتا ہے۔ جبکہ ریاستی معیشت دان قیمتوں پر ریاست کے کنٹرول کو اپنی سیاست کے لیے ناگزیر قرار دیتے ہیں۔

اسمتھ سمجھتا ہے کہ افراد بالعموم ''بچت'' کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ جبکہ ریاستی معیشت دان بالخصوص ''خرچ'' کے پیدائشی ریاستی رجحان کی طرف۔ یہ تصادم معیشت کی افزائش کو مسدود کرتا ہے۔ یوں کہ افراد کی بچت، سرمایہ کاری کا وسیلہ بنتی ہے، جبکہ ریاست کا ''خرچ'' لوگوں کی آمدنی اور نتیجتاً بچت میں شدید تخفیف کا ذریعہ۔

اسمتھ کمپنیوں پر ٹیکس کو معیشت کی افزائش کے ضمن میں نہایت خطرناک قرار دیتا ہے۔ جبکہ پاکستان کے ریاستی معیشت دان دوسرے ٹیکسوں کے علاوہ کمپنیوں سے ''سپر ٹیکس'' بھی نچوڑنا چاہتے ہیں (یاد رہے یہ معاملہ وفاقی آئینی عدالت میں زیرِ غور ہے)۔ اسمتھ قومی قرضے کے سخت خلاف ہے۔ جبکہ ریاستی معیشت دان ملکی اور غیر ملکی دونوں قسم کے قرضوں کو ریاستی معیشت کی رگوں میں دوڑتا لہو سمجھتے ہیں۔

اسمتھ کے نزدیک سکے، یا سونا و چاندی، اور کرنسی دولت نہیں۔ وہ پیداوار کو دولت سمجھتا ہے۔ بلکہ پیداوار کے بھی صرف کو دولت قرار دیتا ہے۔ جبکہ ریاستی معیشت دان ٹیکس کے پیسے کو دولت مانتے ہیں، جس کی مدد سے وہ ریاست اور ریاستی اشرافیہ کے اخراجات کو پورا کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔

حاصلِ بحث یہ کہ اگر اسمتھ سے پاکستان کی معیشت کی ''پراگریس رپورٹ'' تیار کرنے کو کہا جاتا تو جو نتیجہ سامنے آتا وہ منفی ہوتا۔ اور اس منفی رپورٹ کو اسمتھ یوں بیان کرتا: پاکستان کی ریاست کی معیشت کو چھوٹے درجے کے تاجروں کی خفیہ چالاکیوں کی ذہنیت کے ساتھ چلایا جا رہا ہے۔ اور اس ریاست کی یہی سیاست اور یہی سیاسی معیشت ہے۔

فکرِ انسانی کے ارتقا کے ضمن میں اسمتھ کے فکری مقام کو یہ ایک چیز بھی عیاں کرتی ہے۔ اسمتھ اس عہد کے اختتام کا پیامبر ہے، جو مملکتوں کی باہمی لوٹ مار سے عبارت تھا، اور جہاں باایں سبب، اور بشمول دوسری ضروری اشیا کے، سونے چاندی کو برتر دولت سمجھا جاتا تھا۔ اس عہد کا خاصہ مالِ غنیمت پر انحصار تھا۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ، اسمتھ ایک نئے عہد کا پیامبر بھی ہے۔ یہ عہد مالِ غنیمت پر انحصار کے بجائے خود اپنے ہاتھوں کی جانے والی پیداوار پر انحصار کی ایک نئی دنیا کو جنم دے رہا تھا۔ صنعتی انقلاب اس نئی دنیا کا انجن تھا۔ اسمتھ کی ''دولتِ اقوام'' اسی نئی دنیا کے پیداواری اصولوں کی دریافت پر مبنی ہے۔ اور ''اخلاقی احساسات کا نظریہ'' افراد کے مابین تعلقات کے فطری اصولوں کی بازیافت پر۔ دونوں کتابیں ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں۔

اسمتھ نے اپنی پہلی کتاب، ''اخلاقی احساسات کا نظریہ'' 1759 میں 35 برس کی عمر میں شائع کی۔ اس کی دوسری کتاب، ''دولتِ اقوام'' 1776 میں چھپی، جب اس کی عمر 53 برس تھی۔ اس کی وفات 67 برس کی عمر میں ہوئی۔

دونوں کتابوں کو ذہن میں رکھیں تو اسمتھ ایک مفکر کے طور پر سامنے آتا ہے، جس پر مخصوص مابعد الطبیعیاتی موضوعات نہیں، بلکہ انسانوں کے باہمی و معاشی معاملات سے متعلق افکار کا غلبہ ہے۔ اس کے تمام تر خیالات و تصورات کا اژدھام انسانوں کی دنیاداری کے معاملات پر مرتکز ہے۔ اسمتھ ان معاملات کے ساتھ فلسفیانہ انداز میں پیش آتا ہے۔ یوں اپنی فکری تشکیل میں، اسمتھ ایک فلسفی ہے، مگر دنیادار فلسفی۔ یا ایک معاشی فلسفی کہہ لیجیے۔

آدم اسمتھ پاکستان کی ریاست اور اس کے کارپردازوں کے لیے نہ صرف اجنبی ہے، بلکہ غیر ہے اور غالباً ایک پوشیدہ خطرہ بھی۔ مگر پاکستان کے لوگوں کے لیے قطعاً اجنبی نہیں۔ قیامِ پاکستان کے صرف ایک دہے کے اندر، اسمتھ کی ''دولتِ اقوام'' اردو میں چھپ چکی تھی۔ مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، نے اسے 1957 میں تین جلدوں میں شائع کیا۔ پہلی جلد 722 صفحات پر مشتمل ہے اور اس کے مترجم شیخ عطاءاللہ

اور ایچ اے فخری ہیں۔ دوسری اور تیسری جلد کے مترجم ایچ اے فخری اور نگران شیخ عطااللہ ہیں۔ یہ دونوں جلدیں بالترتیب 848 اور 766 صفحات پر مشتمل ہیں۔

''آدم اسمتھ پرائمر'' قریباً سوا سو صفحات کی ایک مختصر کتاب ہے، جس کے مصنف، ''آدم اسمتھ انسٹیٹیوٹ'' کے ڈائریکٹر، ایمن بٹلر ہیں۔ اس پرائمر کا موجودہ اردو ترجمہ محض ایک ترجمہ نہیں۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، اسمتھ کا ذکر اور اسمتھ کے خیالات کا تذکرہ اصل میں پاکستان کی ریاستی معیشت پر ایک کاٹ دار تبصرے کی حیثیت رکھتا ہے۔

پرائم انسٹیٹیوٹ اور مترجم دونوں مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ''دولتِ اقوام'' کی اشاعت کی دو سو پچاسویں سالگرہ کے موقعے پر نہ صرف آدم اسمتھ کو خراجِ تحسین پیش کیا، بلکہ بااین صورت ریاستی معیشت کے کارپردازوں کی یاد دہانی کے لیے اسمتھ کے شہری معیشت اور باہمی انسانی تعلقات کے اصولوں کی طباعت و فروغ کا اہتمام بھی کیا۔

ڈاکٹر خلیل احمد

تشکر

ہم Institute of Economic Affairs (IEA) کے انتہائی شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اپنی نہایت اہم کتاب کے ترجمے کی ذمہ داری ہم پر اعتماد کے ساتھ سونپی۔

ہم محترمہ عاطفہ اصغر، جناب بلال اعجاز گیلانی، جناب حسن داؤد بٹ، جناب امتیاز رستگار اور جناب نجف یاور خان کا شکریہ ادا کرنا بھی واجب سمجھتے ہیں جن کی مدد سے اس ترجمے کی تکمیل اور اشاعت ممکن ہوئی۔

خلاصہ

- کسی قوم کی دولت —— جیسا کہ مر کنٹلسٹ سمجھتے تھے —— اس کے خزانوں میں موجود سونے چاندی کی مقدار نہیں ہوتی، بلکہ اس کی مجموعی پیداوار اور تجارت کا حاصلِ جمع ہوتی ہے —— جسے آج ہم مجموعی قومی پیداوار (GDP) کہتے ہیں۔
- آزادانہ تبادلے میں دونوں فریق بہتر حالت میں آتے ہیں۔ کوئی بھی لین دین میں داخل نہیں ہوتا اگر اسے توقع ہو کہ اسے نقصان ہوگا۔ لہٰذا درآمدات ہمارے لیے اتنی ہی قیمتی ہیں جتنی برآمدات دوسروں کے لیے۔ ہمیں خود کو امیر بنانے کے لیے دوسروں کو غریب کرنے کی ضرورت نہیں —— بلکہ اگر ہمارے گاہک خوشحال ہوں تو ہمارا فائدہ اور بڑھتا ہے۔
- تجارت پر پابندیاں کمزور بنیادوں پر کھڑی اور نتیجہ خیز کے بجائے نقصان دہ ہوتی ہیں۔ خوشحالی کو ٹیکسوں، درآمدی ٹیرف، برآمدی سبسڈیوں اور ملکی صنعتوں کے حق میں دی گئی ترجیحات سے خطرہ لاحق ہوتا ہے۔
- کسی قوم کی پیداواری صلاحیت کی بنیاد محنت کی تقسیم اور اُس کے نتیجے میں ممکن ہونے والا سرمائے کا ارتکاز ہے۔ پیداوار کو بہت سے چھوٹے کاموں میں تقسیم کر کے —— جنہیں ماہر ہاتھ انجام دیں —— پیداوار میں بہت بڑا اضافہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس سے پیدا کرنے والوں کے پاس سرمایہ کاری کے لیے فاضل پیداوار (سرپلس) بچتی ہے۔
- کسی ملک کی آئندہ آمدنی کا انحصار سرمائے کے ارتکاز کی رفتار پر ہوتا ہے۔ جتنا زیادہ سرمایہ بہتر پیداواری طریقوں میں لگایا جائے گا، مستقبل میں اتنی ہی زیادہ دولت پیدا ہو گی۔
- جب آزاد تجارت اور مسابقت موجود ہوں تو منڈی کا نظام خود بخود سب سے فوری ضروریات پر توجہ رکھتا ہے۔ جہاں کسی چیز کی قلت ہو، لوگ اُس کے لیے زیادہ قیمت دینے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ ایسی چیز مہیا کرنے میں زیادہ منافع ہوتا ہے، اس لیے پیدا کنندگان زیادہ پیداوار کے لیے سرمایہ لگاتے ہیں۔

- خوشحالی سب سے تیزی سے اُس وقت بڑھتی ہے جب منڈی کھلی اور مسابقتی ہو—یعنی تبادلہ آزاد ہو اور جبر نہ ہو۔ اس کھلے پن کو قائم رکھنے کے لیے دفاع، انصاف اور قانون کی حکمرانی ضروری ہے۔ آزادی اور ذاتی مفاد انتشار نہیں لاتے، بلکہ—گویا ایک ''غیر مرئی ہاتھ'' کی رہنمائی سے—نظم اور ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں۔
- ذاتی مفاد رکھنے والے گروہ (vested interests) حکومت کی طاقت استعمال کر کے منڈی کے نظام کو اپنے فائدے کے لیے بگاڑتے ہیں۔ آجر اور پیشہ ور طبقے ایسی ضابطہ بندیوں کو فروغ دے سکتے ہیں جو مسابقت کو گھونٹ دیں—مثلاً داخلے کی رکاوٹیں جو لوگوں کو بعض پیشوں میں آنے سے روکیں۔
- ٹیکس آمدنی کے تناسب سے ہونے چاہییں، اور اُن کی ادائیگی یقینی اور سہل ہونی چاہیے۔ اُنہیں وصول کرنا کم خرچ ہو، کاروبار میں رکاوٹ نہ ڈالے، اتنا بھاری نہ ہو کہ لوگ چوری یا بچاؤ کی طرف مائل ہوں، اور نہ ہی ٹیکس وصول کرنے والوں کے بار بار چکر لگوانے پڑیں۔
- انسانوں میں دوسروں کے لیے فطری ''ہمدردی (sympathy)'' یعنی (empathy) پائی جاتی ہے۔ یہ انہیں اپنے رویّے کو اعتدال میں رکھنے اور ہم آہنگی برقرار رکھنے کے قابل بناتی ہے۔ یہی اخلاقی فیصلوں کی بنیاد اور انسانی فضیلت کا سرچشمہ بھی ہے۔ انسانی فطرت، ایک ہم آہنگ معاشرے کی تشکیل کے لیے، جوشیلے اور خیالی منصوبہ سازوں کی حد سے بڑھی ہوئی ''عقل'' سے بہتر رہنما ثابت ہوتی ہے۔

تعارف

گیون کینیڈی[1]

ایمن بٹلر نے آدم اسمتھ—بطور انسان اور بطور مفکر—پر ایک قابلِ تعریف اور مستند تعارف لکھا ہے۔ میری نظر میں مطبوعہ صورت میں یہ اسمتھ پر سب سے بہترین مختصر تعارف ہے، اور یہ کسی بھی قاری کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ سمجھ سکے کہ اسمتھ درحقیقت کس چیز کے بارے میں تھا۔

ایمن بٹلر آدم اسمتھ کی سیاسی معیشت سے متعلق اُن تنازعات سے خوب بچتے ہیں جن پر برسوں سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اسمتھ—شخصیت اور کتابوں—کا یہ بیان اٹھارویں صدی کے دوسرے نصف تک برطانوی معاشرے کے ارتقا کی اُس منفرد ترکیب کا درست اندازہ پیش کرتا ہے جو اسمتھ کے ہاں نظر آتی ہے۔ آدم اسمتھ نے اپنی کم معروف کتاب تھیوری آف مورل سینٹیمنٹس، این انکوائری اِنٹو دی نیچر اینڈ کازز آف دی ویلتھ آف نیشنز سے سترہ سال پہلے شائع کی۔ ان دونوں کے درمیان وقفے سے بعض لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسمتھ نے انسانی عمل کی محرکِ اخلاقی قدر ''خیر خواہی'' کو ترک کر کے اسے ''غیر اخلاقی خود غرضی'' سے بدل دیا۔ مگر 1762–63 میں گمنام طلبہ کی لکھوائی گئی نوٹس سے ہمیں معلوم ہے کہ اسمتھ کے لیکچرز کے بڑے حصے 1776 کی دی ویلتھ آف نیشنز میں تقریباً لفظ بہ لفظ دوبارہ ظاہر ہوئے۔ انہوں نے اخلاقیات پر اپنے لیکچرز (1751–64) کو تھیوری آف مورل سینٹیمنٹس (1759) کی صورت میں شائع کیا۔ لہٰذا آدم اسمتھ انسانی محرکات کے بارے میں متضاد رائے نہیں رکھتے تھے۔

اسمتھ ایک اخلاقی فلسفی تھے۔ اٹھارویں صدی میں معاشیات ابھی وہ الگ شعبہ نہیں بنی تھی جو انیسویں صدی کے اواخر میں بنی۔ درست ہے کہ معاشی موضوعات پر پہلے اور ہم عصر ادوار میں بہت سے مصنفین کے پمفلٹ موجود تھے (ییل یونیورسٹی کے پاس سولہویں سے اٹھارویں صدی تک کے کئی ہزار

---

[1] گیون کینیڈی ہیریئٹ واٹ یونیورسٹی کے پروفیسر ایمریٹس ہیں، اور ایڈم اسمتھز لاسٹ لیگیسی کے مصنف ہیں، جو 2005 میں پیلگریو میکملن نے شائع کی۔

پمفلٹس ہیں)، اور بعض مصنفین نے معاشیات میں خدمات بھی انجام دیں، مگر کسی نے بھی اس پیمانے پر اور اُس نوعیت کی جامع تحقیق پیش نہیں کی جیسی آدم اسمتھ نے کی۔

اسمتھ سے پہلے سیاسی معیشت کا محور حاکم اور ریاست کو سونے چاندی کے ذخیرے سے مالا مال کرنا تھا تاکہ بیرونی جنگوں کے اخراجات پورے کیے جا سکیں۔ دی ویلتھ آف نیشنز نے سیاسی معیشت کی توجہ کو ''زمین اور محنت کی سالانہ پیداوار'' سے صارفین کی خوشحالی کی طرف منتقل کیا۔ یہ کتاب کوئی نصابی متن نہیں تھی؛ یہ خاص طور پر دولت کی حقیقت اور اس کے بڑھنے کے اسباب پر بحث کرتی ہے۔

کتاب اوّل اور دوم انسانی معاشرے کی نمایاں خصوصیات بیان کرتی ہیں—مثلاً تبادلے کی فطری رغبت، محنت کی تقسیم، عوامل پیداوار، منڈیوں کی حرکیات، اور شریک فریقوں کے درمیان آمدنی کی تقسیم۔ کتاب سوم اٹھارویں صدی کے برطانیہ کو معاشرتی ارتقا کے تناظر میں رکھتی ہے: ابتدائی ''شکار'' سے ''چرواہی'' اور ''زراعت'' کے مراحل سے گزرتے ہوئے ''تجارت'' کے عہد تک؛ اور دکھاتی ہے کہ پانچویں صدی میں روم کے زوال نے مغربی یورپ میں اس ''فطری'' پیش رفت کو کیسے منقطع کیا۔

جب پندرھویں صدی کے بعد یورپ نے بحالی شروع کی تو یہ اس بوجھ تلے ہوئی جسے اسمتھ نے ''مرکنٹائل تجارت'' کہا—جس پر کتاب چہارم سخت تنقید کرتی ہے، خصوصاً اس کی بنیادی غلطی پر کہ قومی دولت سونے چاندی کے ذخیرے کے جمع کرنے سے بنتی ہے، اور یہ کہ تجارتی توازن اس لیے اہم ہے کہ ملک کو درآمدات سے زیادہ برآمدات کرنی چاہییں۔ اس سے بھی بڑھ کر، یہ خیال کہ حفاظتی اجارہ داریوں، مزدوروں کی بھرتی اور نقل و حرکت پر پابندیوں، اور قدرتی منڈی آزادیوں میں مداخلت سے داخلی معیشت مضبوط ہو جاتی ہے—اسمتھ کے نزدیک نہایت نقصان دہ تھا۔

ان غلطیوں کے لیے اسمتھ کا علاج یہ تھا کہ منڈیوں کو اُن مداخلتوں سے آزاد کیا جائے جو اُن کی فطری کارکردگی کو بگاڑتی ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ مسابقتی طور پر پیدا ہونے والی پیداوار کے آزاد تبادلے کو وسعت دی جائے تاکہ معاشی نمو کی ''قدرتی'' رفتار شروع ہو سکے—یعنی لوگوں کو یہ موقع ملے کہ وہ دوسروں کے ساتھ ''زمین، محنت یا سرمائے'' کو یکجا کر کے بازاروں کے لیے اشیا پیدا کریں۔ کرایہ داروں

کو کرایہ، مزدوروں کو اجرت اور تاجروں و صنعتکاروں کو منافع ادا کرنے کے بعد، سرمائے کے مالکان اپنے خالص منافع کو مزید پیداواری سرگرمیوں میں دوبارہ لگاتے، اور پھر پیداوار و تبادلے کے مسلسل ادوار کے ذریعے معاشرے کی زمین و محنت کی سالانہ پیداوار سے حقیقی دولت پیدا ہوتی—"جو گردش کے عظیم پہیے" کے مسلسل چکروں میں آہستہ آہستہ بڑھتی رہتی ہے۔

کتاب پنجم میں اسمتھ نے حکومتوں کے مناسب کردار پر گفتگو کی اور اُن کے بنیادی فرائض بیان کیے: دفاع؛ انصاف؛ وہ عوامی کام اور ادارے جو تجارت میں سہولت دیں؛ ''ہر عمر'' کے لوگوں کی تعلیم؛ ''گھناؤنی اور ناگوار بیماریوں'' کے خلاف اقدامات؛ ''حاکم کی عظمت'' برقرار رکھنا؛ اور ان اخراجات کی مالی اعانت ٹیکسوں اور مستفید ہونے والوں پر عائد چارجز کے ذریعے کرنا (سرکاری قرضے کے مقابلے میں زیادہ بہتر طور پر)۔

دی ویلتھ آف نیشنز نے اپنے عہد کے اُن مرکنٹائل ''اصولِ سیاسی معیشت'' کو ہدف بنایا جو روم کے زوال کے بعد یورپ کی بحالی اور جنگی سرداروں و جاگیرداری سے قوم-ریاستوں کے ہزار سالہ ابھرنے کے دوران پنپے۔ گزشتہ دو صدیوں میں بہت سے مصنفین نے اسمتھ کی کتابوں کو مزید دو سو برس کی تحقیق و تجربے کے تناظر میں پرکھا—اور یہ کتابیں حیرت انگیز طور پر اس کڑی جانچ پر پوری اترتی ہیں۔ مغربی یورپ کے اکثر لوگ سخت غریب تھے، اور ان کی مطلق غربت اور مظالم شمالی امریکہ، جنوبی افریقہ اور آسٹریلیشیا کی طرف ہجرت کے بڑے محرکات رہے—یہ سلسلہ بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں تک جاری رہا۔ اسمتھ نے غربت کے محض حقائق سے آگے بڑھ کر اس کے سبب کو دیکھا: یعنی دولت پیدا ہونے کا فقدان۔

نجات صرف معاشروں کے اندر سے آتی ہے—اس صورت میں کہ وہ ایسے حالات پیدا کریں جو دولت تخلیق کریں۔ اسی مسئلے کی طرف انہوں نے انسانوں کے مطالعے میں اپنا تاریخی زاویہ متوجہ کیا۔ اسمتھ کے متون میں کلاسیکی یونانی و لاطینی مصادر سے مثالیں اور اقتباسات جگہ جگہ بکھرے ہیں جن سے وہ پوری طرح واقف تھے۔ اٹھارویں صدی کی روشن خیالی کے بڑے کرداروں کی طرح، وہ

معاشرے کی اصل کی طرف پیچھے دیکھتے تھے—کسی خیالی یوٹوپیا کی طرف آگے نہیں؛ یہ رومانیت انیسویں صدی کی خاصیت تھی، اٹھارویں کی نہیں۔

یورپ کی تہذیب جنگی سردارانہ بربریت اور جاگیرداری میں ڈھل گئی، مگر پھر بھی آہستہ آہستہ (یہ فقرہ اسمتھ کے کام میں بار بار آتا ہے) زرعی پیداوار بحال ہوئی، آبادی بڑھی اور تجارت بکھرے ہوئے میلوں اور منڈیوں میں دوبارہ شروع ہوئی۔ 1760 سے پہلے کے سو برس میں گھریلو استعمال کی اشیا کی وسعت—حتیٰ کہ عام مزدوروں کے سب سے غریب گھروں میں بھی—ایک درجے کی تقابلی ''فراوانی'' دکھاتی تھی (جس کا بڑا حصہ پرانی/استعمال شدہ اشیا سے بھی آتا تھا) جو شمالی امریکہ کے شکاری قبائل اور ان کے طاقتور ترین ''سرداروں'' کی حالت سے بہتر تھی۔

مسافروں کی رپورٹوں اور کرکالڈی کے آس پاس چھوٹی کیل سازی اور پن سازی کی فیکٹریوں اور بھٹیوں کے مشاہدات کو ملا کر اسمتھ نے حقیقی دولت کو سونے چاندی کے ذخیرے میں نہیں، بلکہ معاشرے کی زمین و محنت کی—اگرچہ سادہ اور کھردری—پیداوار کی تیاری اور تقسیم میں دیکھا جو اب محنت کش آبادی کے گھروں میں نمایاں ہونے لگی تھی؛ اور یہی کسی ملک کی نسبتی فراوانی کا حقیقی پیمانہ تھا۔ ان کا ابتدائی انکشاف محض محنت کی تقسیم کو ''دریافت'' کرنا نہیں تھا—یہ اعزاز افلاطون اور ''جدید'' زمانے میں سر ولیم پیٹی (1690) کو جاتا ہے—بلکہ اس کی اہمیت کو سمجھنا تھا: یعنی یہ کہ حقیقی فراوانی کیسے آبادی کی اکثریت میں پھیل سکتی ہے، نہ کہ صرف چند انتہائی امیروں تک محدود رہے؛ اور چند نسلوں میں سب کو بتدریج زیادہ خوشحال بنا سکتی ہے۔

یہیں سے انہوں نے سوال اٹھایا: اگر محنت کی تقسیم کلید ہے، تو کون سی شرائط پیداوار بڑھائیں گی؛ ہر فرد کا حصہ کیسے طے ہوگا؛ اور—سب سے اہم—کون سی رکاوٹیں ہیں جو اس کے راستے میں کھڑی ہیں؟ بیان سے تجزیے کی طرف یہ جست ہی معاشیات کے نئے علم کی بنیادوں کی پہلی اینٹ تھی۔ میں یہاں ایک تجارتی معیشت کے اُس ماڈل کا مختصر خلاصہ پیش کرتا ہوں جو کامل آزادی میں کام کرتی ہے—یہ خلاصہ ایمن بٹلر کی عمدہ پیش کش کے ساتھ تکمیلی رشتہ رکھتا ہے۔

تجارتی معاشرہ محنت کی تقسیم سے پیدا ہونے والی فروخت کے قابل پیداوار کا تبادلہ فروغ دیتا ہے۔ اشیا کے بدلے اشیا کا براہِ راست تبادلہ (بارٹر) اگرچہ قدیم اور غیر مؤثر تھا، مگر پیسے کے ذریعے بالواسطہ تبادلے سے بہت پہلے موجود تھا۔ قدیم تہذیبوں میں کئی ہزار سال پہلے سکّے کا رواج اس بات کی علامت ہے کہ محنت کی تقسیم سے تجارت بہت پہلے وجود میں آچکی تھی (ورنہ سکّوں کی ضرورت ہی کیا تھی؟)۔

ابتدائی تبادلے دیہات کی پیداوار (خوراک اور خام مواد) اور چھوٹے شہروں کی پیداوار (ابتدائی بنے

ہوئے اوزار اور چھوٹی موٹی مصنوعات) کے درمیان ہوتے تھے۔ اشیا کی منڈی قیمتیں رسد اور ''موثر طلب'' سے طے ہوتی ہیں، اور وہ اُن ''قدرتی قیمتوں'' سے مختلف ہو سکتی ہیں جن میں پیداوار کے عوامل کے مالکان (زمین، محنت اور سرمایہ) کو—پیداوار میں شریک ہونے کی صورت میں—بالکل اُنہی لاگتوں کے برابر معاوضہ ملے، جن میں مقامی ''قدرتی شرحِ منافع'' بھی شامل ہو۔ منڈی کی قیمتیں مسلسل اتار چڑھاؤ میں رہتی ہیں—کامل توازن کے گرد گھومتی ضرور ہیں مگر کبھی اس پر ٹھہرتی نہیں—اور ممکن ہے کہ اپنی لاگت بھی پوری نہ کر سکیں۔ تاہم بدلتی ہوئی قیمتیں منڈی کے شرکا کو اشارہ دیتی ہیں کہ کس چیز کے لیے زیادہ یا کم ادائیگی کرنی ہے، اور کس کی زیادہ یا کم رسد کرنی ہے؛ وقت کے ساتھ حقیقی رسد لازماً انہی اشاروں کے مطابق ڈھلتی ہے۔ یہی ایک مسابقتی معیشت کی حرکیات ہیں۔

محنت یا تو پیداواری ہوتی ہے یا غیر پیداواری—اس فرق کا دار و مدار اس پر ہے کہ آیا محنت، جب مستقل سرمائے کے ساتھ مل کر کام کرے، ایسی اشیا پیدا کرتی ہے جو بازار میں فروخت ہوں اور اپنی لاگت پوری کریں، جن میں کاروبار کے منافع بھی شامل ہوں۔ غیر پیداواری محنت کی ''پیداوار'' (مثلاً خدام جو کسی امیر گھرانے کے کھانے کی خدمت کریں) بازار میں فروخت ہو کر اپنی لاگت پوری نہیں کرتی، لہٰذا وہ آمدنی میں سے صرف کھپت ہے؛ جبکہ پیداواری محنت کی پیداوار اپنی لاگت پوری کر کے خالص آمدنی (منافع) پیدا کرتی ہے، جسے یا تو کھپت (فضول خرچی) میں استعمال کیا جا سکتا ہے یا خالص

سرمایہ کاری (کفایت شعاری) میں۔ وقت کے ساتھ قومیں تب زیادہ امیر ہوتی ہیں جب اُن میں کفایت شعار پیدا کرنے والوں کا تناسب، فضول خرچ صارفین کے تناسب سے زیادہ ہو۔

خالص سرمایہ کاری کی سالانہ رفتار سے معیشت روزگار بڑھاتی ہے (اجرتیں بڑھتی ہیں اور کمزور ترین اکثریت میں فراوانی پھیلتی ہے)، اور پھر ''زندگی کی ضروریات، آسانیوں اور تفریحات'' کی سالانہ پیداوار بڑھتی ہے۔ بدقسمتی سے روم کے زوال نے اس قدرتی عمل میں خلل ڈالا، اور جب ہزار سال بعد معیشت نے بحالی کی، کھیتی باڑی کی نئی ٹیکنالوجیوں اور سائنس کی نشاۃِ ثانیہ سے ابھرنے والے تکنیکی امکانات سے فائدہ اٹھایا، تو معاشروں نے ایسے سیاسی ادارے بھی بنا لیے تھے—جن میں مذہبی جمود (ڈاگماٹزم) بھی شامل تھا—جو غلط مرکنٹائل خیالات کو قانون بنا کر نافذ کرتے تھے، اور اس طرح معیشت کے قدرتی ارتقا کو روکتے تھے۔

کامل آزادی پر سمجھوتہ ہو گیا: آزاد تجارت کے خلاف ٹیرف، ڈیوٹیاں اور پابندیاں نافذ ہوئیں؛ شہروں کی گلڈز اور ہنر ور انجمنوں کی اجارہ داریاں قائم ہوئیں جنہوں نے منڈی میں آزاد داخلے اور خروج کی مسابقتی برکات کم کر دیں۔ انہوں نے محنت کے اس فطری حق کو بھی روکا کہ لوگ اُن پیشوں میں کام کریں جن میں انہوں نے طویل شاگردی نہ کی ہو؛ افراد کو بعض اشیا بیچنے یا خریدنے سے روکا جو مخصوص مقامی علاقوں میں پیدا نہ ہوتی ہوں؛ اور ''تجارتی توازن'' کے مرکنٹائل سراب کے پیچھے درآمدات و برآمدات پر ڈیوٹیاں، رعایتیں (drawbacks) اور انعامات (bounties) عائد کیے—اور اس کا نقصان صارفین کو ہوا۔

تشویش ناک حقیقت یہ ہے کہ خالص سرمایہ کاری کی مثبت رفتار برقرار رکھنے میں جو رکاوٹیں آدم اسمتھ کو کھٹکتی تھیں، اُن میں سے بہت سی اکیسویں صدی میں بھی ہمارے ساتھ موجود ہیں—اسی طرح مرکنٹائل ذہنیت رکھنے والی قانون ساز اسمبلیوں اور عوام پسند جھوٹوں کے ذریعے انہیں بڑھاوا دیا جاتا ہے۔ آج کی عالمی معیشت میں، جہاں ترقی یافتہ ممالک میں مطلق غربت اب وہ مسئلہ نہیں رہا جو اسمتھ کے زمانے میں تھا، دنیا کے ترقی پذیر اور غیر ترقی پذیر ممالک میں مطلق اور نسبتی غربت کا مسئلہ تمام

ماہرینِ معاشیات کے دلوں کو حرکت دینی چاہیے—جیسے اس نے آدم اسمتھ کے دل و دماغ کو کیا تھا—جو پسِ منظر میں دیکھیں تو پہلے ماہرِ معاشیات تھے۔

دی ویلتھ آف نیشنز کے بارے میں جو ''مشکل'' اور ''غیر متعلق'' ہونے کی شکایات کی جاتی ہیں، اُن میں سے اکثر ''ضمنی باتوں'' اور تفصیلی توضیحات سے نہیں، بلکہ اس بات کی غلط فہمی سے پیدا ہوتی ہیں کہ وہ اصل میں کیا کر رہے تھے۔ وہ جدید طرز کے ''اصولِ معاشیات'' کے مصنف نہیں تھے—جب اسمتھ زندہ تھے تو یہ مضمون موجود ہی نہ تھا۔ انہوں نے قومی دولت کے حقیقی معنی، دولت کے بڑھنے کے اسباب، معاشرے کے فراوانی کی طرف بڑھنے کے عمل، اور اُن رکاوٹوں کی تحقیق کی رپورٹ لکھی جو اس پیش رفت کو روکتی ہیں۔ یہ صحیح وقت پر صحیح کتاب تھی۔ یہی اُن کی ذہانت اور اُن کی وراثت ہے—اور ایمن بٹلر کی پیش کش آپ کے لیے یہ سمجھنے کا بہترین موقع ہے۔

۱۔آدم اسمتھ کی اہمیت

آدم اسمتھ (1723–1790) ایک اسکاٹش فلسفی اور ماہرِ معاشیات تھے۔ وہ خاص طور پر اپنی کتاب An Inquiry into the Nature and Causes of the Wealth of Nations (1776) کے مصنف کے طور پر مشہور ہیں، جسے آج بھی تاریخ کی سب سے زیادہ اثر انداز کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اسمتھ نے معاشی زندگی کے بارے میں ہماری سوچ کو ایک پرانے اور محدود انداز سے نکال کر ایک واضح طور پر جدید رخ دیا۔ ان کا نقطۂ نظر اس بات کی ایک نئی سمجھ پر مبنی تھا کہ انسانی معاشرہ در حقیقت کیسے کام کرتا ہے۔

معاشیات کا روایتی تصور

حقیقت یہ ہے کہ اسمتھ نے معاشیات کے بارے میں سوچ میں اتنی بڑی تبدیلی پیدا کی کہ آج یہ تصور کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ ان کے زمانے میں رائج معاشی نظام کیسا تھا۔ اس نظام کو مرکنٹیلزم کہا جاتا تھا۔ اس کے مطابق کسی ملک کی دولت کا اندازہ اس کے پاس موجود سونے اور چاندی کے ذخائر سے لگایا جاتا تھا۔ بیرونِ ملک سے اشیا درآمد کرنا نقصان دہ سمجھا جاتا تھا، کیونکہ اس کا مطلب یہ لیا جاتا تھا کہ ان اشیا کی قیمت ادا کرنے کے لیے قیمتی دھاتیں ملک سے باہر چلی جائیں گی۔ اس کے برعکس، اشیا برآمد کرنا فائدہ مند تصور کیا جاتا تھا، کیونکہ اس سے سونا اور چاندی واپس آنے کی امید کی جاتی تھی۔ اس سوچ کے تحت تجارت کو صرف فروخت کرنے والے کے لیے فائدہ مند سمجھا جاتا تھا، خریدار کے لیے نہیں۔ یہ بھی مانا جاتا تھا کہ ایک قوم اسی وقت امیر ہو سکتی ہے جب دوسری قومیں غریب ہوں۔

اسی نقطۂ نظر کی بنیاد پر پابندیوں کا ایک پورا نظام قائم کیا گیا، تاکہ قومی دولت کو ملک سے باہر جانے سے روکا جا سکے۔ اس میں درآمدات پر ٹیکس، برآمد کنندگان کو سبسڈیز، اور مقامی صنعتوں کو تحفظ دینا شامل تھا۔ اسی نظام کے تحت برطانیہ نے اپنی امریکی نوآبادیات پر بھی سخت پابندیاں عائد کیں، جن کے نتائج بعد میں تباہ کن ثابت ہوئے۔ مجموعی طور پر، ہر قسم کی تجارت کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اور تحفظ پسندی کی سوچ نے اندرونی معیشت کو بھی اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔

شہروں نے دوسرے علاقوں کے کاریگروں کو آکر اپنا ہنر استعمال کرنے سے روک دیا۔ صنعت کاروں اور تاجروں نے بادشاہ سے خصوصی اجارہ داریاں حاصل کرنے کی کوششیں کیں۔ یہاں تک کہ محنت بچانے والے نئے آلات، جیسے اسٹاکنگ فریم، کو بھی موجودہ پیدا کنندگان کے لیے خطرہ سمجھا گیا اور بعض جگہوں پر ان پر پابندی لگادی گئی۔

آزاد تبادلے کی پیداواری صلاحیت

اسمتھ نے واضح کیا کہ مرکنٹیلزم کا یہ پورا نظام ایک بنیادی غلط فہمی پر کھڑا تھا، اور حقیقت میں فائدے کے بجائے نقصان پہنچا رہا تھا۔ ان کا استدلال سادہ مگر نہایت مضبوط تھا: آزاد تبادلے میں دونوں فریق فائدہ اٹھاتے ہیں۔[2] بات بالکل سیدھی ہے۔ کوئی بھی شخص ایسے تبادلے میں شامل نہیں ہوتا جس سے اسے نقصان ہونے کی توقع ہو۔ جس طرح فروخت کنندہ فائدہ حاصل کرتا ہے، اسی طرح خریدار بھی فائدے میں رہتا ہے۔ درآمدات ہمارے لیے اتنی ہی قیمتی ہوتی ہیں جتنی ہماری برآمدات دوسروں کے لیے۔ ہمیں خود کو امیر بنانے کے لیے دوسروں کو غریب کرنے کی ضرورت نہیں۔ درحقیقت، اگر ہمارے خریدار خوشحال ہوں تو ہمیں مزید فائدہ پہنچتا ہے۔

آزاد تبادلے کی اس بنیادی حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے، اسمتھ کا کہنا تھا کہ تجارت اور تبادلہ ہماری خوشحالی میں اسی طرح اضافہ کرتے ہیں جیسے زراعت یا صنعت۔ کسی قوم کی دولت اس کے خزانوں میں موجود سونے اور چاندی کی مقدار سے نہیں ناپی جا سکتی، بلکہ اس کی مجموعی پیداوار اور تجارتی سرگرمیوں سے جانی جاتی ہے۔ آج ہم اسی تصور کو مجموعی قومی پیداوار یا Gross Domestic Product کے نام سے جانتے ہیں۔

یہ خیال اس زمانے میں نیا تھا، مگر غیر معمولی طور پر طاقتور۔ اس نے ان تجارتی دیواروں میں ایک بڑا فکری شگاف ڈال دیا جو سولہویں صدی سے یورپی ریاستوں کے گرد کھڑی کی گئی تھیں۔ اس کے

---

[2] دی ویلتھ آف نیشنز، کتاب چہارم، باب سوم، حصہ دوم، صفحہ 493، پیراگراف c9 ۔ (نوٹس میں درج صفحات کی تعداد ایڈم اسمتھ کی تصانیف اور مراسلت کے گلاسگو ایڈیشن کے مطابق ہے۔ منتخب کتب نامہ ملاحظہ کیجیے۔)

عملی اثرات بھی جلد سامنے آنے لگے۔ The Wealth of Nations اپنی براہِ راست، تیز اور چیلنج کرنے والی اسلوبِ تحریر، طنزیہ ذہانت، اور بے شمار مثالوں کی وجہ سے خاص طور پر ان لوگوں کے لیے قابلِ فہم تھی جو عملی ذہن رکھتے تھے اور ان خیالات کو عمل میں ڈھال سکتے تھے۔

اگرچہ یہ کتاب امریکی نوآبادیات کے ساتھ جنگ کو روکنے کے لیے بہت دیر سے شائع ہوئی، لیکن اس نے وزیرِ اعظم ولیم پِٹ کی آزاد تجارت اور سادہ ٹیکس نظام کی حمایت کے لیے فکری بنیاد فراہم کی۔ بعد ازاں، سر رابرٹ پیل کے زرعی منڈیوں کو آزاد کرنے کے اقدامات بھی اسی سوچ سے جڑے ہوئے تھے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب انیسویں صدی میں آزاد تجارت اور معاشی توسیع کے عظیم دور کی بنیاد بنی۔ حتیٰ کہ آج بھی آزاد تجارت کی عقلی منطق دنیا بھر میں تسلیم کی جاتی ہے، چاہے اسے عملی طور پر نافذ کرنا کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو۔

آزادی پر مبنی سماجی نظم

آدم اسمتھ اس بات کا پورا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اس کے خیالات کے اثرات کتنے وسیع ہوں گے۔ تاہم ذاتی اور تجارتی آزادی پر بڑھتا ہوا یہ اعتماد براہِ راست انسانی معاشروں کے حقیقی طریقۂ کار کے بارے میں اس کی انقلابی اور تازہ فہم سے جنم لیتا ہے۔ اسمتھ اس نتیجے پر پہنچا کہ سماجی ہم آہنگی کسی منصوبہ بندی کے تحت نہیں، بلکہ فطری طور پر اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان ایک دوسرے کے ساتھ جینے اور کام کرنے کے عملی طریقے تلاش کرتے ہیں۔

اس کے نزدیک آزادی اور ذاتی مفاد لازماً انتشار کا سبب نہیں بنتے۔ اس کے برعکس، یہ عناصر گویا کسی ''غیر مرئی ہاتھ'' کی رہنمائی میں نظم اور ہم آہنگی کو جنم دیتے ہیں۔ یہی عوامل وسائل کے سب سے مؤثر استعمال کی راہ بھی ہموار کرتے ہیں۔ جب آزاد افراد صرف اپنی حالت بہتر بنانے کے لیے دوسروں کے ساتھ تبادلہ کرتے ہیں، تو قوم کی زمین، سرمایہ، مہارتیں، علم، وقت، کاروباری صلاحیت اور اختراعی قوت خود بخود ان مقاصد کی طرف منتقل ہو جاتی ہے جنہیں لوگ سب سے زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔

یوں ایک خوشحال سماجی نظم کو برقرار رکھنے کے لیے بادشاہوں اور وزیروں کی مسلسل نگرانی ضروری نہیں رہتی۔ یہ انسانی فطرت کے نتیجے کے طور پر خود رو انداز میں تشکیل پاتا ہے۔ البتہ بہترین

طریقے سے پنپنے اور مؤثر انداز میں کام کرنے کے لیے اس نظم کو ایک کھلی اور مسابقتی منڈی درکار ہوتی ہے، جہاں تبادلہ آزاد ہو اور جبر کی گنجائش نہ ہو۔

اس کھلے پن کو برقرار رکھنے کے لیے کچھ عمومی قواعد ضروری ہوتے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے آگ کو قابو میں رکھنے کے لیے انگھیٹی درکار ہوتی ہے۔ لیکن یہ قواعد — یعنی انصاف اور اخلاقیات کے اصول — عمومی اور غیر شخصی ہوتے ہیں، مرکنٹیلزم کے دور کے حکام کی مخصوص اور شخصی مداخلتوں کے برعکس۔

اسی لیے The Wealth of Nations محض معاشیات کی کتاب نہیں تھی جیسا کہ ہم آج اس مضمون کو سمجھتے ہیں، بلکہ یہ انسانی سماجی نفسیات پر ایک انقلابی تصنیف تھی۔ اس میں زندگی، فلاح و بہبود، سیاسی اداروں، قانون اور اخلاقیات جیسے موضوعات پر بھی گہری بحث ملتی ہے۔

اخلاقیات کی نفسیات

آدم اسمتھ کا تعلق ایک ایسے دور سے تھا جب ایک تعلیم یافتہ دانشور کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ علم کے تقریباً تمام بڑے شعبوں سے واقف ہو۔ سائنس، فنون، ادب، فلسفہ، قدیم علوم اور اخلاقیات — یہ سب اس کے فکری دائرے میں شامل تھے، اور اسمتھ واقعی اسی روایت کی نمائندگی کرتا تھا۔ اس نے ایک وسیع ذاتی کتب خانہ جمع کیا، لبرل آرٹس کی تاریخ لکھنے کا منصوبہ بنایا، اور قانون و حکومت پر کتاب تحریر کرنے کا ارادہ بھی رکھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کی ابتدائی شہرت کی بنیاد The Wealth of Nations نہیں بنی، بلکہ اخلاقیات پر اس کی کتاب The Theory of Moral Sentiments تھی۔ آج یہ کتاب نسبتاً کم معروف ہے، مگر اپنے زمانے میں یہ The Wealth of Nations جتنی ہی بااثر سمجھی جاتی تھی، اور خود اسمتھ کے نزدیک بھی اتنی ہی اہم تھی۔

The Theory of Moral Sentiments اس بنیاد کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے جس پر ہم اخلاقی فیصلے قائم کرتے ہیں۔ ایک بار پھر، اسمتھ اس معاملے کو انسانی نفسیات سے جوڑتا ہے۔ اس کے مطابق انسانوں میں دوسروں کے لیے ایک فطری ''ہمدردی'' موجود ہوتی ہے — جسے آج ہم

''احساسِ ہم آہنگی'' یا empathy کہتے ہیں—اور یہی ہمدردی انسان کو اپنے رویّے متوازن رکھنے اور سماجی ہم آہنگی برقرار رکھنے میں مدد دیتی ہے۔

اسی ہمدردی کی بنیاد پر ہم انسانی رویّوں کے بارے میں اخلاقی فیصلے کرتے ہیں، اور یہی انسانی فضیلت اور اخلاقی زندگی کا اصل سرچشمہ بنتی ہے۔

ذاتی مفاد اور اخلاقی رویّہ

آج بعض لوگ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اسمتھ کے معاشی نظریے میں مرکزی کردار ادا کرنے والا ذاتی مفاد اس اخلاقی رویّے کے ساتھ کیسے ہم آہنگ ہو سکتا ہے جسے وہ انسانی معاشرت کی بنیاد سمجھتا ہے۔ اسمتھ خود اس سوال کا جواب نہایت سادہ مگر گہرے انداز میں دیتا ہے:

''انسان خواہ کتنا ہی خود غرض کیوں نہ سمجھا جائے، اس کی فطرت میں کچھ ایسے اصول بہر حال موجود ہوتے ہیں جو اسے دوسروں کی حالت سے وابستہ رکھتے ہیں، اور ان کی خوشی کو اس کے لیے اہم بنا دیتے ہیں، چاہے اسے اس سے کوئی براہِ راست فائدہ حاصل نہ ہو، سوائے اس خوشی کے جو اسے یہ منظر دیکھ کر محسوس ہوتی ہے۔[3]''

دوسرے لفظوں میں، انسانی فطرت یک رُخی نہیں بلکہ پیچیدہ ہے۔ نانبائی ہمیں روٹی خیر خواہی کے جذبے سے فراہم نہیں کرتا، لیکن اسی طرح یہ بھی درست نہیں کہ محض ذاتی مفاد ہی کسی انسان کو دریا میں چھلانگ لگا کر ڈوبتے ہوئے اجنبی کو بچانے پر آمادہ کرتا ہے۔

اسمتھ کی دونوں کتابیں دراصل اسی حقیقت کو سمجھنے کی تکمیلی کوششیں ہیں: کہ ذاتی مفاد رکھنے والے انسان کس طرح—اور حقیقت میں کس طرح—اخلاقی طور پر قابلِ قبول انداز میں ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں، اور ساتھ ہی معاشی سرگرمیوں میں نتیجہ خیز کردار ادا کرتے ہیں۔

---

[3] تھیوری آف مورل سینٹیمنٹس، حصہ اوّل، باب اوّل، صفحہ 9، پیرا گراف 1۔

چنانچہ The Wealth of Nations اس قسم کی بے رحم یا غیر انسانی سرمایہ داری کی حمایت نہیں کرتی جیسی کہ اسے بعض اوقات غلط طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اگرچہ ذاتی مفاد معیشت کو متحرک کرتا ہے، لیکن جب مقابلہ واقعی آزاد ہو اور کسی قسم کا جبر یا زبردستی شامل نہ ہو، تو یہی ذاتی مفاد ایک مثبت اور تعمیری قوت بن جاتا ہے۔

اسمتھ کی تحریر میں انسان دوستی اور سماجی فلاح کی فکر واضح طور پر جھلکتی ہے۔ وہ قوم کی مجموعی بہبود — خاص طور پر غریب طبقے کی حالت بہتر بنانے — کو طاقت ور تاجروں اور مفاداتی گروہوں کے محدود مفادات پر ترجیح دیتا ہے، آزاد مقابلے کو نقصان پہنچانے والے صنعت کاروں پر تنقید کرتا ہے، اور ان حکومتوں کی بھی مذمت کرتا ہے جو ایسے رویّوں کی سرپرستی کرتی ہیں۔

انسانی فطرت اور انسانی معاشرہ

اٹھارہویں صدی کے مفکرین آہستہ آہستہ اس نتیجے پر پہنچ رہے تھے کہ معاشرے کی بنیاد صرف وہ عقائد نہیں ہو سکتے جو علما کی طرف سے منتقل کیے گئے ہوں، یا وہ احکامات جو سیاسی اقتدار کے ذریعے نافذ کیے جائیں۔ بعض مفکرین نے تو قانون اور اخلاقیات کے لیے مکمل طور پر ''عقلی'' نظام ترتیب دینے کی کوشش بھی کی۔ لیکن آدم اسمتھ کا نقطۂ نظر اس سے مختلف تھا۔ اس کے نزدیک انسانی معاشرہ — جس میں سائنس، زبان، فنون، تجارت اور روزمرہ تعلقات سب شامل ہیں — کسی بیرونی منصوبہ بندی کا نتیجہ نہیں، بلکہ انسانی فطرت میں گہرائی سے جڑا ہوا ہے۔

اسمتھ نے اس بات پر زور دیا کہ ہمارے فطری رجحانات، حد سے زیادہ تجریدی اور نظریاتی عقل کے مقابلے میں، ہمیں بہتر رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ اگر ہم محض غیر ضروری ترجیحات، امتیازات اور پابندیوں[4] کو ختم کر دیں اور ''فطری آزادی'' پر بھروسا کریں، تو ہم انجانے میں، مگر یقینی طور پر، ایک ایسے سماجی نظم کی طرف بڑھنے لگتے ہیں جو زیادہ ہم آہنگ، پُرامن اور مؤثر ہوتا ہے۔

---

[4] دی ویلتھ آف نیشنز، کتاب چہارم، باب نہم، حصہ دوم، صفحہ 687، پیراگراف 51۔

یہ آزاد سماجی نظم اپنی بقا کے لیے بادشاہوں اور وزیروں کی مسلسل نگرانی کا محتاج نہیں ہوتا۔ البتہ اس کا دارومدار اس بات پر ضرور ہوتا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ برتاؤ کے کچھ بنیادی اصولوں کی پابندی کریں—— مثلاً انصاف، اور دوسروں کی جان اور ملکیت کا احترام۔ جب یہ بنیادی اصول قائم رہیں، تو مجموعی طور پر ایک مستحکم اور کارآمد سماجی نظم خود بخود وجود میں آجاتا ہے۔ اسمتھ کی فکری جستجو کا اصل مقصد بھی یہی تھا: ان فطری انسانی اصولوں کی نشاندہی کرنا جو حقیقت میں ایسے خوش آئند سماجی نتائج کو جنم دیتے ہیں۔

۲۔اسمتھ کی زندگی اور پیشہ ورانہ سفر

آدم اسمتھ کی والدہ مارگریٹ ڈگلس اس وقت حاملہ تھیں جب ان کے شوہر، جو ایک بااثر وکیل اور سابق کسٹمز افسر تھے، جنوری 1723 میں وفات پا گئے۔ پانچ جون کو انہوں نے اپنے بچے کی پیدائش درج کروائی اور اسے اپنے مرحوم شوہر کا نام دیا: آدم اسمتھ۔ یہی بچہ آگے چل کر اپنے عہد کے نمایاں ترین مفکرین میں شمار ہوا اور تاریخ کی سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والی کتابوں میں سے ایک کا مصنف بنا۔

کرکالڈی اور گلاسگو

اسمتھ کے ابتدائی برسوں کے بارے میں ہمیں بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ اتنا ضرور معلوم ہے کہ تین سال کی عمر میں وہ کچھ عرصے کے لیے خانہ بدوشوں کے ہاتھوں اغوا ہو گیا تھا، یہاں تک کہ اس کے چچا نے اسے بازیاب کرا لیا۔ اس کے علاوہ، اس کے بچپن کی تفصیلات زیادہ محفوظ نہیں رہیں۔ تاہم اس کے جائے پیدائش کی روزمرہ زندگی نے لازماً اسے وہ تجربات فراہم کیے جنہوں نے بعد میں اس کے فکری سفر کو شکل دی۔ اسکاٹ لینڈ کی بندرگاہی بستی کرکالڈی[5]، جو فرتھ آف فورتھ کے پار ایڈنبرا کے سامنے واقع ہے، اس وقت ایک سرگرم تجارتی مرکز تھی۔ یہاں جہاز مچھلی اتارتے، مقامی کانوں سے نکلا ہوا کوئلہ برآمد کرتے، اور لوہے کے کام کی صنعت[6] کے لیے کباڑ لوہا واپس لاتے تھے۔

اسمتھ انہی ملاحوں، مچھلی کے تاجروں، کیل بنانے والوں، کسٹمز افسروں اور اسمگلروں کے درمیان پلا بڑھا۔ یہی وہ پیشے اور سرگرمیاں تھیں جن کی جھلک وہ بعد میں The Wealth of Nations میں دکھاتا ہے۔ لیکن اس دوران حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ امریکا کے ساتھ بڑھتی ہوئی تجارت، خاص طور پر تمباکو اور کپاس جیسی اجناس میں، نے جدید مغربی بندرگاہوں مثلاً گلاسگو کو پرانی مشرقی بندرگاہوں جیسے کرکالڈی پر برتری دے دی۔ اسمتھ کی عظیم تصنیف میں ہمیں انہی بدلتے

---

[5] آر۔ایچ۔ کیمبل اور اے۔ایس۔اسکنر، ایڈم اسمتھ، کروم ہلم، لندن، 1982، صفحات 9–10۔

[6] ای۔جی۔ویسٹ، ایڈم اسمتھ: دی مین اینڈ ہز ورکس، لبرٹی فنڈ، انڈیانا پولس، انڈیانا، 1976، صفحہ 31۔

ہوئے تجارتی رجحانات اور ان پر انحصار کرنے والی برادریوں کی زندگیوں میں آنے والی تبدیلیوں کی تصویر بھی ملتی ہے۔

اسمتھ کے اسکولی دور ہی میں کتابوں سے اس کی گہری دلچسپی اور اس کی غیر معمولی یادداشت نمایاں ہو گئی تھی۔ چودہ برس کی عمر میں—جو اس زمانے میں عام بات تھی—وہ University of Glasgow میں داخل ہوا۔ یہاں اس نے عظیم اخلاقی فلسفی فرانسس ہچیسن کے زیرِ تعلیم پڑھائی کی۔ ہچیسن آزادی پسند، عقل پر یقین رکھنے والے، افادیت کو اہم سمجھنے والے، صاف گو اور اقتدار کے لیے ایک مستقل چیلنج تصور کیے جاتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان میں سے کئی خصوصیات اسمتھ کی شخصیت اور فکر میں بھی منتقل ہو گئیں۔

آکسفورڈ اور مراعات

آدم اسمتھ نے غیر معمولی کارکردگی دکھائی اور آکسفورڈ کے Balliol College میں وظیفہ حاصل کر لیا۔ 1740 میں، جب اس کی عمر صرف سترہ برس تھی، وہ گھوڑے پر ایک ماہ طویل سفر کے لیے روانہ ہوا۔ اگرچہ تجارتی لحاظ سے ترقی کرتا ہوا گلاسگو، پسماندہ کرکالڈی سے آنے والے ایک لڑکے کے لیے آنکھیں کھول دینے والا تجربہ تھا، لیکن آکسفورڈ اسے ایک بالکل مختلف دنیا محسوس ہوا۔ اسمتھ نے وہاں کی شاندار عمارتوں اور صحت مند، فربہ مویشیوں کا ذکر کیا—جو اس کے آبائی اسکاٹ لینڈ کے کمزور اور خستہ حال مویشیوں سے بالکل مختلف تھے۔

تاہم انگریزی تعلیمی نظام اس پر اچھا اثر نہ چھوڑ سکا۔ درحقیقت، اس نے اسے بگڑی ہوئی مراعات (perverse incentives) کی طاقت کا ایک اہم سبق دیا، جسے وہ بعد میں The Wealth of Nations میں نہایت سخت انداز میں بیان کرتا ہے۔ آکسفورڈ میں اساتذہ کو طلبہ کی فیس کے بجائے کالج کے بڑے اوقاف (endowments) سے تنخواہیں ملتی تھیں۔ نتیجتاً—اسمتھ کے الفاظ میں—"عوامی پروفیسروں کی اکثریت نے کئی برسوں سے تدریس کی محض دکھاوے کی

کوشش بھی ترک کر دی تھی[7]''، اور کالج کی زندگی اس طرح ترتیب دی گئی تھی کہ وہ ''طلبہ کے فائدے کے لیے نہیں بلکہ زیادہ درست طور پر اساتذہ کی سہولت کے لیے ہو[8]''۔

یوں اسمتھ کی معاشی سمجھ بوجھ تیزی سے پختہ ہوتی چلی گئی۔ اس کے باوجود، بیلیول کالج کی عالمی معیار کی لائبریری نے اسے یہ موقع دیا کہ وہ کلاسیکی علوم، ادب اور دیگر مضامین میں خود تعلیم حاصل کر سکے۔ 1746 میں—اپنی وظیفہ مدت پوری ہونے سے پہلے ہی—وہ آکسفورڈ چھوڑ کر کرکالڈی واپس آ گیا، جہاں اس نے دو سال ادب، طبیعیات، منطق اور سائنسی طریقِ کار کے مطالعے اور تحریر میں گزارے۔

ابتدائی تدریسی کیریئر

خاندانی روابط کے ذریعے، لارڈ کیمز—جو ایک ممتاز وکیل اور مفکر تھے—نے اسمتھ کو ایڈنبرا میں انگریزی ادب اور فلسفۂ قانون پر عوامی لیکچرز دینے کی دعوت دی۔ ان لیکچرز سے واضح ہوتا ہے کہ اسمتھ اپنی بیس کی دہائی ہی میں ان بنیادی خیالات پر کام کر رہا تھا—مثلاً تقسیمِ محنت—جو بعد میں The Wealth of Nations کی فکری بنیاد بنے۔

یہ لیکچرز غیر معمولی طور پر کامیاب رہے اور اسمتھ کے اگلے کیریئر مرحلے کی راہ ہموار ہوئی۔ 1751 میں، ستائیس برس کی عمر میں، وہ دوبارہ University of Glasgow واپس گیا—اس بار منطق، اخلاقی فلسفہ، ادب اور خطابت (rhetoric) کی تدریس کے لیے۔ (اس دور میں ''خطابت'' سے مراد محض اسلوب اور ابلاغ کے مطالعے تک محدود تھی، جیسا کہ آج عام طور پر سمجھا جاتا ہے، ویسا نہیں۔)

اس کے فلسفے کے کورس میں الٰہیات، اخلاقیات، فقہ (jurisprudence) اور عوامی پالیسی شامل تھے۔ فقہ اور پالیسی پر دیے گئے لیکچرز—جو صرف طلبہ کے نوٹس کی صورت میں محفوظ رہ

---

[7] دی ویلتھ آف نیشنز، کتاب پنجم، باب اوّل، حصہ سوم، مضمون دوم، صفحہ 761، پیرا گراف f8۔

[8] ایضاً، کتاب پنجم، باب اوّل، حصہ سوم، مضمون دوم، صفحہ 764، پیرا گراف f15۔

سکے—میں کئی ایسے خیالات ملتے ہیں، جیسے قیمتوں کے نظام کی کارکردگی، تحفظ پسند پالیسیوں کی خامیاں، اور حکومتی و معاشی اداروں کی تدریجی ارتقا۔ یہ خیالات برسوں بعد تقریباً اسی صورت میں The Wealth of Nations میں سامنے آئے۔

لیکن درحقیقت اسمتھ کی اخلاقیات پر غور و فکر ہی وہ موڑ تھا جس نے اس کی قسمت بدل دی۔ 1759 میں اس نے انہی خیالات کو The Theory of Moral Sentiments کے عنوان سے شائع کیا۔ یہ کتاب اسلوب کے لحاظ سے نفیس اور فکر کے اعتبار سے منفرد تھی، اور اس میں اخلاقی فیصلوں کی وضاحت انسانی سماجی نفسیات کی بنیاد پر کی گئی تھی۔

اسمتھ کے دوست، فلسفی اور مورخ ڈیوڈ ہیوم نے اس کتاب کی نقول اپنے کئی دوستوں کو بھیجیں۔ ان میں سے ایک سیاست دان چارلس ٹاؤنشینڈ اتنا متاثر ہوا کہ اس نے فوراً اسمتھ کو اپنے سوتیلے بیٹے، نوجوان ڈیوک آف بکلُو، کا ذاتی اتالیق مقرر کر لیا—اور یہ تقرری سالانہ تین سو پاؤنڈ کی فراخ دلانہ تنخواہ کے ساتھ، عمر بھر کے لیے تھی۔

سفر

اگرچہ آدم اسمتھ غیر معمولی ذہانت کا مالک تھا، لیکن ذاتی اتالیق کے طور پر اس کا انتخاب بظاہر کچھ عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔ مصنف جیمز بوزویل کے مطابق اس کا ذہن ''ہر طرح کے خیالات سے بھرا رہتا تھا''، اور اسی وجہ سے وہ اپنی شدید بھولپن کے لیے مشہور تھا۔

ایک مرتبہ وہ خیالوں میں اس قدر گم تھا کہ چائے بنانے کے بجائے اس نے روٹی اور مکھن ابال دیے۔ ایک اور موقع پر کسی مسئلے پر غور کرتے ہوئے وہ آٹھ میل پیدل چلتا ہوا ڈنفرملین جا پہنچا، اور تب جا کر اسے احساس ہوا کہ وہ کہاں آ نکلا ہے۔ ایک بار وہ سڑک پر دھیان نہ دینے کے باعث ایک کھڈے میں بھی جا گرا۔

لیکن زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ اسمتھ اور اس کا شاگرد فرانس روانہ ہو گئے۔ اس دور میں ایسے اسفار ہر نوجوان اشرافیہ کی تعلیم کا لازمی حصہ سمجھے جاتے تھے۔ پیرس میں انہوں نے ڈیوڈ ہیوم کی صحبت سے لطف اٹھایا، جو اس وقت وہاں برطانوی سفیر کے ذاتی سیکرٹری تھے۔

تاہم اسمتھ کی بول چال کی فرانسیسی خاصی کمزور تھی، اور اسے نئے لوگوں سے روابط قائم کرنے میں دشواری پیش آتی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ اکتاہٹ کا شکار ہو گیا اور اس نے ہیوم سے کہا": میں نے وقت گزارنے کے لیے ایک کتاب لکھنا شروع کر دی ہے[9]۔" وہ کتاب The Wealth of Nations تھی۔

اپنے بعد کے سفروں میں، جب وہ فرانس کے جنوب سے گزرتا ہوا جنیوا گیا اور پھر واپس پیرس لوٹا، اسمتھ نے یورپ کی ثقافت، طرزِ حکومت، تجارت، ضوابط اور معاشی زندگی کے بارے میں بے شمار مشاہدات جمع کیے۔ اس نے ان سب کا اپنے وطن کی صورتحال سے موازنہ کیا۔ براعظم یورپ کے کئی نمایاں مفکرین سے ہونے والی گفتگوؤں نے اس کی اس عظیم تصنیف پر جاری فکری محنت کو مزید نکھار دیا۔

دی ویلتھ آف نیشنز

1766 میں یہ دونوں لندن واپس لوٹے۔ اسمتھ دوبارہ کرکالڈی میں آباد ہو گیا، جہاں اب وہ ہائی اسٹریٹ پر ایک کشادہ مکان خریدنے کی استطاعت رکھتا تھا۔ وہ یہاں اپنی والدہ اور کزن جینیٹ کے ساتھ رہتا تھا۔ اسمتھ اپنی والدہ سے گہری وابستگی رکھتا تھا اور 1784 میں ان کی وفات تک ان کی خدمت میں مصروف رہا۔ اس نے کبھی شادی نہیں کی، اگرچہ بظاہر اس کی جوانی میں ایک مرتبہ ایک ایسی نوجوان خاتون سے وابستگی رہی جو حسن اور قابلیت دونوں میں نمایاں تھی۔[10]

اسمتھ نے کرکالڈی میں کئی برس گزارے—مسودہ لکھتے، اس میں بار بار ترمیم کرتے اور اسے نکھارتے ہوئے۔ اس محنت کی کچھ قیمت اسے اپنی صحت کی صورت میں بھی چکانی پڑی۔ تاہم 1773 سے 1776 تک لندن میں گزارا گیا ایک طویل عرصہ اس کے لیے تازگی کا باعث بنا، جہاں اسے اپنے عہد کے دیگر بڑے اذہان کی رفاقت حاصل رہی۔

---

[9] ڈیوڈ ہیوم کے نام خط، مورخہ 5 جولائی 1764۔

[10] ڈی۔ اسٹیورٹ، 'ایڈم اسمتھ ایل ایل ڈی کی زندگی اور تصانیف کا بیان'، 1794، دی گلاسگو ایڈیشن میں، جلد سوم، نوٹ K، صفحات 349–50۔

ان میں مصور سر جوشوا رینالڈز، قدیم تاریخ کے ماہر ایڈورڈ گبن، سیاست دان ایڈمنڈ برک، خود بوزویل، اور حتیٰ کہ — اختلافِ رائے کے باوجود — لغت نویس ڈاکٹر سیموئل جانسن بھی شامل تھے۔ بالآخر مارچ 1776 میں The Wealth of Nations شائع ہوئی۔ یہ ایک بڑی تجارتی کامیابی ثابت ہوئی، اور چند ہی برسوں میں اس کے کئی ایڈیشن اور مختلف زبانوں میں تراجم سامنے آ گئے۔ عملی سطح پر بھی اس کے اثرات نمایاں ہونے لگے، اور اس کی تجاویز — مثلاً تجارت کی آزادی (trade liberalisation) — رفتہ رفتہ عوامی پالیسی کا حصہ بننے لگیں۔

کمشنر آف کسٹمز

اسمتھ کو ایڈنبرا میں کمشنر آف کسٹمز کے عہدے پر فائز کیا گیا، جس کے ساتھ سالانہ 600 پاؤنڈ کی معقول تنخواہ مقرر تھی۔ برطانیہ کے غیر مؤثر اور من مانی کسٹمز نظام کا سخت ناقد اب اس پوزیشن میں تھا کہ عملی طور پر بہتری لا سکے — اور اس نے یہ ذمہ داری پوری محنت اور دیانت سے نبھائی[11]۔

اس نے دیگر معاملات پر بھی مشورے دیے، جن میں آئرلینڈ پر عائد تجارتی پابندیوں کی مخالفت اور امریکی نوآبادیات میں بڑھتی ہوئی بے چینی پر رائے شامل تھی۔ بعد ازاں وزیرِاعظم ولیم پِٹ نے فرانس کے ساتھ تجارتی معاہدہ کرنے اور ملک کے ٹیکس نظام میں بڑی اصلاحات نافذ کرنے کے لیے اسمتھ کے اصولوں سے رہنمائی لی۔

اسمتھ کو دوستوں کے ساتھ گفتگو اور بحث بے حد پسند تھی۔ جولائی 1790 میں ایڈنبرا میں ایسی ہی ایک محفل کے دوران وہ تھکن محسوس کرنے لگا۔ یہ کہتے ہوئے کہ یہ گفتگو کسی اور وقت جاری رکھی جائے گی، وہ بستر پر چلا گیا۔ چند ہی دن بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ اسے اپنے کینن گیٹ کے گھر کے قریب واقع چرچ کے صحن میں ایک سادہ مگر باوقار یادگار کے نیچے دفن کیا گیا۔

---

11 کیمبل اور اسکنر، ایڈم اسمتھ، صفحات 200–203۔

۳۔ دی ویلتھ آف نیشنز

کتاب کے بڑے موضوعات

آدم اسمتھ نے The Wealth of Nations جزوی طور پر اس مقصد سے لکھی کہ سیاست دانوں کو ان پالیسیوں سے ہٹایا جائے جو تجارت کو محدود اور بگاڑ دیتی ہیں، اور اسے آزادانہ طور پر کام کرنے دیا جائے۔ اسی لیے اس نے سادہ، براہِ راست اور عملی زبان استعمال کی، جو آج بھی باآسانی سمجھی جاسکتی ہے۔

لیکن اسمتھ کا مقصد صرف سیاست دانوں پر تنقید کرنا نہیں تھا۔ وہ دراصل معاشیات کو ایک باقاعدہ اور منظم علمی شعبے کے طور پر قائم کرنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ یہ اپنے وقت میں ایک بالکل نیا اور انقلابی کام تھا۔ اسی وجہ سے بعض اوقات اس کی اصطلاحات اور مثالوں کو آج کے جدید معاشی فہم کے ساتھ جوڑنا آسان نہیں رہتا۔

اس کی تحریر اسلوب کے اعتبار سے تفصیلی ہے، طویل ضمنی بحثوں سے بھری ہوئی ہے، اور مثالوں کی کثرت رکھتی ہے — چین میں چاندی کی قیمت سے لے کر لندن میں آئرش طوائفوں کی خوراک تک۔ یہ سب کچھ مل کر کتاب کو پڑھنے میں مشکل بنا سکتا ہے۔ اسی لیے بہتر ہے کہ پہلے اس کے چند بنیادی موضوعات پر توجہ دی جائے۔

1. تجارت پر پابندیاں نقصان دہ ہیں

کتاب کا سب سے نمایاں موضوع یہ ہے کہ تجارت پر عائد کی جانے والی پابندیاں نہ تو کسی مضبوط بنیاد پر قائم ہوتی ہیں اور نہ ہی مفید ثابت ہوتی ہیں۔ اسمتھ کے نزدیک یہ پالیسیاں اکثر الٹا نقصان پہنچاتی ہیں۔

اس کے دور میں ایک عام تصور رائج تھا جسے مرکنٹیلزم کہا جاتا تھا۔ اس کے مطابق کسی قوم کی دولت کا اندازہ اس کے پاس موجود سونے اور چاندی کی مقدار سے لگایا جاتا تھا۔ اس سوچ کے تحت قوم کو

امیر بنانے کا طریقہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ اشیا دوسروں کو بیچی جائیں، اور کم سے کم اشیا باہر سے خریدی جائیں، تاکہ نقد دولت ملک سے باہر نہ جائے۔

اسی تصور کے نتیجے میں درآمدی محصولات، برآمدی سبسڈیز، مختلف ٹیکس، اور مقامی صنعتوں کے لیے خصوصی مراعات کا ایک پیچیدہ نظام قائم کیا گیا، جس کا مقصد درآمدات کو روکنا اور برآمدات کو بڑھانا تھا۔

2. دولت کا اصل پیمانہ پیداوار ہے

اسمتھ کا انقلابی مؤقف یہ تھا کہ کسی قوم کی دولت اس بات سے متعین نہیں ہوتی کہ اس کے خزانے میں کتنا سونا اور چاندی جمع ہے۔ اصل پیمانہ وہ اشیا اور خدمات ہیں جو ایک معاشرہ مسلسل پیدا کرتا ہے۔

یوں اس نے وہ تصور پیش کیا جو آج معاشیات میں نہایت بنیادی سمجھا جاتا ہے، یعنی مجموعی قومی پیداوار (GDP)[12]۔ اسمتھ کے مطابق اس پیداوار کو بڑھانے کا طریقہ یہ نہیں کہ لوگوں کی صلاحیتوں پر پابندیاں لگائی جائیں، بلکہ یہ ہے کہ انہیں کام کرنے کی آزادی دی جائے۔

3. تقسیمِ محنت اور سرمایہ

کتاب کا ایک اور مرکزی نکتہ یہ ہے کہ پیداواری صلاحیت کی بنیاد تقسیمِ محنت اور سرمائے کے اجتماع پر ہوتی ہے۔ جب پیداوار کو کئی چھوٹے مراحل میں تقسیم کر دیا جائے، اور ہر مرحلہ مخصوص مہارت رکھنے والے افراد انجام دیں، تو کارکردگی میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں پیدا کرنے والوں کے پاس اضافی پیداوار بچتی ہے، جسے وہ یا تو تبادلے میں استعمال کر سکتے ہیں، یا پھر نئی اور زیادہ مؤثر، محنت بچانے والی مشینری میں سرمایہ کاری کے لیے لگا سکتے ہیں۔

4. سرمایہ اور مستقبل کی خوشحالی

اسمتھ کے مطابق کسی ملک کی مستقبل کی آمدنی کا دارومدار اسی سرمائے کے اجتماع پر ہوتا ہے۔ جتنا زیادہ سرمایہ بہتر اور مؤثر پیداواری طریقوں میں لگایا جائے گا، اتنی ہی زیادہ دولت آئندہ پیدا ہو گی۔

---

[12] یہ نکتہ پی۔ جے۔ اورورک نے نہایت خوبصورتی سے پیش کیا ہے: آن دی ویلتھ آف نیشنز، اٹلانٹک منتھلی پریس، نیویارک، 2006، صفحات 7–8۔

لیکن اس کے لیے ایک شرط ضروری ہے: لوگوں کو یہ اعتماد ہونا چاہیے کہ ان کا سرمایہ محفوظ ہے۔ وہی ممالک خوشحال ہوتے ہیں جہاں ملکیت کا تحفظ ہو، سرمایہ دانشمندی سے استعمال ہو، اور اسے چوری یا زبردستی کے خطرات لاحق نہ ہوں۔

5. قیمتوں کا خودکار نظام

اسمتھ کا چوتھا اہم نکتہ یہ ہے کہ منڈی کا نظام بنیادی طور پر **خودکار** ہوتا ہے۔ جہاں کسی چیز کی کمی ہو، لوگ اس کے لیے زیادہ قیمت ادا کرنے کو تیار ہوتے ہیں۔ زیادہ منافع دیکھ کر پیدا کرنے والے مزید سرمایہ لگاتے ہیں اور پیداوار بڑھاتے ہیں۔ اس کے برعکس، جہاں کسی شے کی بہتات ہو، وہاں قیمتیں اور منافع کم ہو جاتے ہیں، اور سرمایہ کسی اور سمت منتقل ہو جاتا ہے۔

یوں صنعت کسی مرکزی ہدایت کے بغیر ہی معاشرے کی اہم ترین ضروریات کی طرف متوجہ رہتی ہے۔ لیکن یہ خودکار نظام صرف اسی وقت درست کام کرتا ہے جب آزاد تجارت اور حقیقی مسابقت موجود ہو۔ اگر حکومتیں مخصوص پیدا کنندگان کو سبسڈیاں، اجارہ داریاں، یا ٹیرف کی دیواروں کے ذریعے تحفظ دیں، تو قیمتیں مصنوعی طور پر بڑھ جاتی ہیں۔ اس کا سب سے زیادہ نقصان غریب طبقے کو اٹھانا پڑتا ہے، کیونکہ انہیں اپنی بنیادی ضروریات کہیں زیادہ مہنگی ملتی ہیں۔

6. معاشی ترقی اور ریاستی ادارے

کتاب کا ایک اور اہم موضوع یہ ہے کہ معاشی ترقی کے مختلف مراحل کس طرح مختلف نوعیت کے حکومتی اداروں کو جنم دیتے ہیں۔ ابتدائی شکاری معاشروں میں قابلِ قدر ملکیت بہت کم تھی۔ لیکن جب انسان کسان بنے تو زمین، فصلیں اور مویشی قیمتی اثاثے بن گئے، اور انہی کی حفاظت کے لیے حکومت اور نظامِ انصاف کے ادارے وجود میں آئے۔

تجارت کے دور میں، جب سرمائے کا اجتماع بڑھتا ہے، تو ملکیت کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ اسی مرحلے پر ایسے تاجر بھی سامنے آتے ہیں جو منڈی کو اپنے حق میں موڑنے اور سیاسی عمل کو ذاتی مفادات کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اجارہ داریاں، خصوصی ٹیکس رعایتیں، اور سرکاری پابندیاں مسابقت اور آزاد تبادلے کو شدید نقصان پہنچاتی ہیں۔

7. حکومت کا محدود کردار

ان تمام وجوہات کی بنا پر اسمتھ کے نزدیک حکومت کا دائرۂ اختیار محدود ہونا چاہیے۔ حکومت کے چند بنیادی فرائض ہیں:

- بیرونی دفاع کو برقرار رکھنا
- اندرونی امن وامان قائم رکھنا
- بنیادی ڈھانچہ فراہم کرنا
- اور تعلیم کو فروغ دینا

اس کے علاوہ حکومت کو چاہیے کہ منڈی کو کھلا اور آزاد رکھے، اور ایسے اقدامات سے گریز کرے جو معاشی سرگرمیوں کو بگاڑنے یا مسخ کرنے کا باعث بنیں۔

پیداوار اور تبادلہ

The Wealth of Nations کی پانچ ''کتابوں'' میں سے پہلی کتاب پیداوار اور تبادلے کے طریقۂ کار پر مرکوز ہے۔ اس میں اسمتھ یہ واضح کرتا ہے کہ یہ دونوں عوامل کس طرح کسی قوم کی آمدنی اور خوشحالی میں اضافہ کرتے ہیں۔

تخصص کے فوائد

آدم اسمتھ تقسیمِ محنت کے فوائد کو سمجھانے کے لیے ایک پن بنانے والی فیکٹری کی مثال دیتا ہے۔ بظاہر پن بنانا ایک نہایت سادہ کام لگتا ہے، مگر حقیقت میں یہ خاصا پیچیدہ عمل ہے۔ تار کو کھینچ کر لمبا کرنا، اسے سیدھا کرنا، کاٹنا، نوک دار بنانا، سر کے لیے اوپری حصہ چپٹا کرنا، سر تیار کر کے جوڑنا، پنوں کو سفید کرنا اور آخر میں انہیں پیک کرنا—اس پورے عمل میں تقریباً اٹھارہ مختلف مراحل شامل ہوتے ہیں۔ اسمتھ کے مطابق اگر ایک ہی شخص یہ تمام مراحل خود انجام دے، تو وہ شاید ایک دن میں بیس پن بھی تیار نہ کر سکے۔ اور اگر اسے دھات نکالنے اور پگھلانے کا کام بھی خود کرنا پڑے، تو ممکن ہے ایک سال میں بھی ایک پن نہ بنا سکے۔

لیکن فیکٹری میں یہی کام مختلف افراد میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، جہاں ہر شخص صرف ایک یا دو مخصوص مراحل سرانجام دیتا ہے۔ اس طرح دس افراد پر مشتمل ایک ٹیم ایک دن میں تقریباً 48,000 پن تیار کر لیتی ہے—یعنی فی فرد 4,800 پن۔ یہ ایک اکیلے شخص کی ممکنہ پیداوار سے تقریباً 240 گنا زیادہ ہے۔

یہ تخصص صرف ایک فیکٹری تک محدود نہیں رہتا، بلکہ مختلف صنعتوں اور حتیٰ کہ مختلف ممالک کے درمیان بھی ظاہر ہوتا ہے۔ کسان فصلیں اگانے اور مویشی پالنے میں مہارت حاصل کرتے ہیں، جس سے زمین بہتر طور پر استعمال ہوتی ہے اور پیداوار بڑھتی ہے۔ صنعت کار گھریلو استعمال کی اشیا بنانے میں مہارت پیدا کرتے ہیں، اور خوراک کی پیداوار کسانوں پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اسی طرح ممالک بھی تخصص اختیار کرتے ہیں: وہ وہ اشیا برآمد کرتے ہیں جن کی پیداوار میں وہ بہتر ہوتے ہیں، اور وہ اشیا درآمد کرتے ہیں جنہیں دوسرے ممالک زیادہ مؤثر انداز میں پیدا کرتے ہیں۔

اسمتھ کے مطابق پیداوار میں یہ اضافہ صرف اس لیے نہیں ہوتا کہ لوگ ایک ہی کام بار بار کرنے سے ماہر ہو جاتے ہیں۔ تخصص سے ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں منتقل ہونے میں وقت کا ضیاع بھی کم ہو جاتا ہے، اور لوگ مخصوص، محنت بچانے والی مشینری استعمال کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں، جس سے پیداوار مزید بڑھتی ہے۔ اسی لیے وہ لکھتا ہے:

''محنت کی پیداواری قوت میں سب سے بڑی بہتری، اور وہ مہارت، پھرتی اور درست فیصلہ جس کے ساتھ محنت بروئے کار لائی جاتی ہے، زیادہ تر تقسیمِ محنت ہی کا نتیجہ ہیں۔[13]''

تقسیمِ محنت روزمرہ استعمال کی نہایت سادہ اشیا کی تیاری میں بھی ہزاروں افراد کے باہمی تعاون کو یکجا کر دیتی ہے۔ مثال کے طور پر، ایک یومیہ مزدور کا پہنا ہوا اون کا کوٹ—چاہے وہ بظاہر کتنا ہی کھردرا کیوں نہ ہو—درحقیقت بے شمار کاریگروں کی مشترکہ محنت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ چرواہے سے لے کر اون چھانٹنے والے، رنگریز، سوت کاتنے والے، بُنکروں، اور کپڑا تیار کرنے والوں تک—سب اپنی اپنی

---

[13] دی ویلتھ آف نیشنز، کتاب اوّل، باب اوّل، صفحہ 13، پیرا گراف 1۔

مہارتیں یکجا کرتے ہیں۔اس کے علاوہ اون کی ترسیل کے لیے ملاح، جہاز ساز اور بادبان بنانے والے درکار ہوتے ہیں، اور حتیٰ کہ اون کاٹنے والی قینچی بھی کان کنوں اور لوہے کے کاریگروں کی محنت کے بغیر ممکن نہیں۔[14]

یہ فہرست گویا کبھی ختم نہیں ہوتی۔ مگر یہی وسیع باہمی تعاون ترقی یافتہ معاشروں کی دولت کا اصل سرچشمہ ہے، اور اسی کے باعث اون کے کوٹ جیسی اشیا غریب ترین لوگوں کی پہنچ میں بھی آ جاتی ہیں—— جسے اسمتھ ''وہ ہمہ گیر خوشحالی'' کہتا ہے جو معاشرے کے نچلے ترین طبقوں تک پھیلتی ہے۔[15]

تبادلے سے باہمی فوائد

کتاب کا دوسرا نہایت اہم باب یہ وضاحت کرتا ہے کہ مادی تبادلہ کس طرح اس پیداواری کارکردگی کے فوائد کو پوری برادری میں پھیلا دیتا ہے۔اسمتھ فرض کرتا ہے کہ کسی ابتدائی معاشرے میں ایک شخص تیروں کی تیاری میں زیادہ ماہر ہو سکتا ہے، جبکہ دوسرا دھات سازی میں۔ تخصص اختیار کرنے کے نتیجے میں تیر بنانے والا اپنی ضرورت سے کہیں زیادہ تیر تیار کر لیتا ہے، اور لوہار اپنی ضرورت سے زیادہ دھار دار اوزار۔ چنانچہ وہ تیروں کے بدلے دھاریں حاصل کر لیتے ہیں۔

اب دونوں کے پاس ایسے اوزار ہوتے ہیں جو وہ خود مؤثر طریقے سے نہیں بنا سکتے تھے، اور دونوں ایک دوسرے کی مہارت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔اسمتھ کے مطابق ''لین دین، بارٹر اور تبادلے'' کی رغبت انسانی رویّے کی ایک فطری اور عالمگیر خصوصیت ہے، کیونکہ اس میں دونوں فریق فائدہ اٹھاتے ہیں۔اگر کسی بھی فریق کو یہ لگے کہ اسے نقصان ہو گا، تو تبادلہ سرے سے ہو ہی نہیں سکتا۔

اسمتھ کے زمانے میں بھی—— بالکل آج کی طرح—— زیادہ تر تبادلہ پیسے کے ذریعے ہوتا تھا۔ چونکہ پیسے کو خود دولت سمجھا جاتا تھا، اس لیے بظاہر یہی محسوس ہوتا تھا کہ فائدہ صرف فروخت کرنے والے کو ہوتا ہے۔ لیکن اسمتھ دکھاتا ہے کہ فائدہ دراصل باہمی ہوتا ہے۔تبادلے کے ذریعے دونوں فریق وہ

---

[14] ایضاً، کتاب اوّل، باب اوّل، صفحہ 22، پیرا گراف 11۔

[15] ایضاً، کتاب اوّل، باب اوّل، صفحہ 22، پیرا گراف 10۔

اشیا حاصل کر لیتے ہیں جو وہ چاہتے ہیں، اور وہ بھی اس محنت سے کہیں کم محنت کے ساتھ جو انہیں خود وہ اشیا بنانے میں کرنا پڑتی۔ اس طرح دونوں زیادہ خوشحال ہو جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں، دولت کوئی جامد شے نہیں بلکہ انسانی تبادلے کے ذریعے پیدا ہوتی ہے—اور یہی اسمتھ کا انقلابی نکتہ تھا۔

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ یہ تبادلہ اس وقت بھی فائدہ مند رہتا ہے جب ہر فریق سودا محض اپنے ذاتی مفاد میں کرتا ہے، نہ کہ دوسرے کی بھلائی کے لیے۔ اسمتھ کے مشہور الفاظ میں:

''ہم اپنا کھانا قصائی، شراب بنانے والے یا نانبائی کی مہربانی سے نہیں پاتے، بلکہ ان کے اپنے مفاد کے خیال سے پاتے ہیں۔ ہم ان کی انسانیت سے نہیں بلکہ ان کے مفاد سے مخاطب ہوتے ہیں۔[16]''

اسمتھ کے نزدیک ''ذاتی مفاد'' سے مراد لالچ یا خود غرضی نہیں۔ اٹھارہویں صدی کے مفہوم میں اس کا مطلب اپنی فلاح و بہبود کا ایک جائز اور مناسب خیال رکھنا ہے، نہ کہ دوسروں کو نقصان پہنچا کر فائدہ اٹھانا۔ اسی لیے وہ The Theory of Moral Sentiments میں اسے ''احتیاط'' (prudence)[17] کا نام دیتا ہے، اور ساتھ ہی اس بات پر زور دیتا ہے کہ ''ہمدردی'' اور ''انصاف''—یعنی دوسروں کو نقصان نہ پہنچانا—انسانی معاشرے کی بنیادی اخلاقی بنیادیں ہیں۔

وسیع منڈیاں، بڑے فوائد

اسمتھ کے مطابق تبادلے سے حاصل ہونے والے فائدے ہی ہمیں تخصص اختیار کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ اور جب تخصص بڑھتا ہے تو پیداوار بھی بڑھتی ہے، پھر وہ اضافی پیداوار دوسروں کے ساتھ تبادلے میں کام آتی ہے۔ لیکن تخصص کہاں تک جا سکتا ہے؟ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ تبادلہ کتنی وسعت کے ساتھ ممکن ہے، یعنی منڈی کتنی بڑی ہے۔[18]

---

[16] ایضاً، کتاب اوّل، باب دوم، صفحات 26–27، پیرا گراف 12۔

[17] تھیوری آف مورل سینٹیمنٹس، حصہ ششم، دفعہ اوّل۔

[18] دی ویلتھ آف نیشنز، کتاب اوّل، باب سوم۔

مثال کے طور پر صرف ایک بڑا شہر ہی اتنے گاہک فراہم کر سکتا ہے کہ وہاں بوجھ اٹھانے والے مزدوروں (پورٹرز) کی باقاعدہ ضرورت پیدا ہو۔ اس کے برعکس بکھری ہوئی آبادیوں میں اکثر اتنے وسائل نہیں ہوتے کہ وہ ماہر بڑھئی یا پتھر تراش کو مستقل کام دے سکیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لوگوں کو یہ کام خود ہی کرنے پڑتے ہیں، اور تخصص محدود رہ جاتا ہے۔

منڈی کو وسیع کرنے والی ایک بڑی چیز پیسہ ہے۔[19] زندگی بہت مشکل ہو جائے اگر بھوکے شراب بنانے والوں کو ہر وقت پیاسے نانبائی تلاش کرنا پڑیں۔ اسی لیے ہم پیسے کو تبادلے کے ذریعے کے طور پر استعمال کرتے ہیں: ہم اپنی زائد پیداوار کے بدلے پیسہ لیتے ہیں، اور پھر اسی پیسے سے وہ چیزیں خریدتے ہیں جن کی ہمیں ضرورت ہوتی ہے۔

قدر کا پیمانہ

چاہے تبادلہ پیسے کے ذریعے ہو یا اشیا کے بدلے اشیا کے، ایک بنیادی سوال پھر بھی باقی رہتا ہے: مختلف چیزیں ایک دوسرے کے بدلے کس شرح پر تبدیل ہوتی ہیں؟ اسمتھ کے لیے یہ بات معما تھی کہ کوئی چیز جو بظاہر غیر ضروری ہو (مثلاً ہیرا) اس کی ''قدرِ تبادلہ'' بہت زیادہ کیوں ہوتی ہے، جبکہ ایک نہایت ضروری چیز (مثلاً پانی) کی قدرِ تبادلہ بہت کم کیوں ہوتی ہے۔ آج ہم اس مسئلے کی وضاحت حدّی افادیت (marginal utility) کے نظریے سے بھی کر سکتے ہیں، اور رسد و طلب (supply and demand) کے تجزیے سے بھی۔

لیکن اسمتھ کے زمانے میں حدّی افادیت کا نظریہ موجود نہیں تھا، اور کتاب کے اس حصے تک پہنچتے پہنچتے اسمتھ نے رسد و طلب کا تجزیہ بھی ابھی مکمل طور پر مرتب نہیں کیا تھا۔ اسی لیے وہ اس بات کی نشاندہی کرنے میں جدوجہد کرتا ہے کہ آخر کسی شے میں وہ کون سی بات ہے جو اسے ایک خاص قدر دیتی ہے۔

---

[19] ایضاً، کتاب اوّل، باب چہارم۔

اسے یہ بات فطری معلوم ہوتی تھی کہ ابتدائی معاشروں میں قدر کی بنیاد اصل میں محنت پر ہونی چاہیے۔[20] آخر ہم کوئی چیز بناتے وقت ''مشقت اور محنت'' اسی لیے برداشت کرتے ہیں کہ پھر ہمیں وہی چیز خود بنانے کی زحمت نہ اٹھانی پڑے جسے ہم خرید رہے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی چیز کو خود کم محنت میں بنا سکتا ہو تو اسے خریدنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اس لیے اسمتھ کے نزدیک تبادلے کی مناسب شرح کو دونوں جانب کی محنت کا کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور دینا چاہیے۔

اسی اصول کو وہ ایک مثال سے واضح کرتا ہے: اگر شکاریوں کے لیے اوندا (بیور) کا شکار ہرن کے شکار کے مقابلے میں دوگنی محنت مانگتا ہو، تو ایک بیور کا تبادلہ دو ہرنوں کے برابر ہونا ''فطری'' بات ہے۔[21] البتہ اسمتھ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ ہر محنت ایک جیسی نہیں ہوتی۔ کہیں زیادہ سخت مشقت ہوتی ہے، کہیں زیادہ ذہانت درکار ہوتی ہے، اور کہیں تربیت اور تجربے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اسمتھ کے مطابق ان فرقوں کو منڈی میں ہونے والی سودے بازی خود بخود کسی حد تک سامنے لے آتی ہے۔[22]

کتاب کے اس حصے پر بعض ناقدین نے یہ کہہ کر تنقید کی ہے کہ اسمتھ یہاں ''محنتی نظریہ قدر (labour theory of value) ''پیش کرتا ہے، اور بعد میں کارل مارکس نے اسی سے فائدہ اٹھا کر یہ دعویٰ کیا کہ مزدور کی محنت کو سرمایہ دار باقاعدگی سے ہڑپ کر لیتا ہے۔ لیکن اس حصے کو اسمتھ کا حتمی مؤقف سمجھنا درست نہیں۔ دراصل وہ یہاں ''قدر'' کے مسئلے کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے، اور اس سمت بڑھ رہا ہے جسے آج ہم پیداوار کی مجموعی لاگت کے طور پر دیکھتے ہیں۔

شکاری معاشروں میں یہ لاگت تقریباً پوری کی پوری محنت ہوتی ہے۔ مگر انسانی معاشرہ اس مرحلے سے آگے بڑھ چکا تھا۔ اسی لیے اسمتھ آگے چل کر پیداوار کے دوسرے عوامل کی طرف آتا ہے، یعنی زمین اور سرمایہ۔ پھر وہ بعد میں رسد اور طلب کو بھی زیرِ بحث لاتا ہے، اور دکھاتا ہے کہ یہ صرف

---

[20] ایضاً، کتاب اوّل، باب پنجم۔

[21] ایضاً، کتاب اوّل، باب ششم، صفحہ 65، پیرا گراف 1۔

[22] ایضاً، کتاب اوّل، باب پنجم، صفحہ 49، پیرا گراف 4۔

قیمت ہی نہیں بلکہ پورے پیداواری اور تقسیم کے نظام کو حرکت دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس حصے کو الگ تھلگ نہیں، بلکہ آگے آنے والے ابواب کے ساتھ ملا کر پڑھنا زیادہ درست ہے۔[23]

زمین، محنت اور سرمایہ

اسمتھ کے مطابق جدید دور میں کسی بھی قسم کی پیداوار کے لیے تین چیزیں درکار ہوتی ہیں:

1. کام کرنے والے لوگ
2. آلات اور مشینری
3. وہ جگہ یا زمین جہاں یہ کام ہو

یوں پیداوار کی مجموعی لاگت کو تین بڑے عوامل میں بانٹا جا سکتا ہے[24]: محنت، سرمایہ، اور زمین۔ شکاری معیشت کے برعکس، جدید معاشرے میں یہ عوامل عموماً مختلف لوگوں کے پاس ہوتے ہیں، اسی لیے پیداوار سے حاصل ہونے والی آمدنی بھی مختلف صورتوں میں تقسیم ہوتی ہے۔

- محنت کے بدلے مزدور کو اجرت ملتی ہے۔
- سرمایہ لگانے والے (جسے اسمتھ "stock" کہتا ہے) کو منافع ملتا ہے۔
- زمین کے استعمال کے بدلے زمیندار کو کرایہ یا لگان ملتا ہے۔

یوں زمین، سرمایہ اور محنت تینوں ہی پیداوار میں حصہ ڈالتے ہیں، اور مزدور، سرمایہ لگانے والے اور زمیندار ایک دوسرے پر انحصار کرنے لگتے ہیں۔ یہ انحصار صرف پیداوار تک محدود نہیں رہتا، کیونکہ زیادہ تر پیداوار تبادلے کے لیے ہوتی ہے۔ اس لیے یہی تینوں عوامل قدر کے تعین اور آمدنی کی تقسیم میں بھی بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ اسمتھ ہمیں آہستہ آہستہ اس سمجھ تک لے جاتا ہے کہ کسی قوم کی پیداوار، اس کی قدر بندی، اور اس کی تقسیم الگ الگ چیزیں نہیں۔ یہ سب ایک ہی وقت میں، ایک ہی معاشی نظام کے اندر، باہم جڑے ہوئے عمل کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ اپنے زمانے میں یہ سوچ واقعی ایک بڑی نظریاتی پیش رفت تھی۔

---

[23] ایضاً، کتاب اوّل، ابواب پنجم تا یازدہم۔

[24] ایضاً، کتاب اوّل، باب ششم۔

منڈیاں پیداوار کو کس طرح سمت دیتی ہیں

اس کے بعد اسمتھ بتاتا ہے کہ منڈی کا نظام پیداوار کو کیسے آگے بڑھاتا ہے اور اسے کس سمت میں لے جاتا ہے۔ اس کے مطابق اشیا جس قیمت پر حقیقت میں منڈی میں فروخت ہوتی ہیں، اسے وہ ''بازاری قیمت ''کہتا ہے۔ یہ قیمت کبھی کسی شے کی مجموعی پیداواری لاگت سے زیادہ ہوتی ہے اور کبھی کم۔اس مجموعی لاگت کو وہ ''قدرتی قیمت ''کا نام دیتا ہے۔[25]

بازاری قیمت دو باتوں سے بنتی ہے:

1. اس شے کی طلب—— یا کم از کم ان خریداروں کی ''موثر طلب''جن کے پاس واقعی خریدنے کی طاقت ہو
2. وہ مقدار جو منڈی میں لائی جاتی ہے (رسد)

اگر بازاری قیمت پیداواری لاگت سے زیادہ ہو تو فروخت کنندگان کو منافع ہوتا ہے۔اور اگر کم ہو تو انہیں نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

بازاری قیمت زیادہ دیر تک لاگت سے کم نہیں رہ سکتی، کیونکہ لوگ مسلسل نقصان برداشت کرنے کے بجائے اس کاروبار سے نکل جانا بہتر سمجھیں گے۔ لیکن بازاری قیمت زیادہ دیر تک بہت زیادہ بھی نہیں رہ سکتی۔ اگر منافع غیر معمولی ہو جائے تو حریفوں کی توجہ فوراً ادھر جاتی ہے، رسد بڑھتی ہے، اور قیمت دوبارہ نیچے آجاتی ہے۔ یوں صنعت کار رجحان آخر کار اس طرف ہو جاتا ہے کہ منڈی میں اتنی ہی مقدار آئے جو توازن میں درکار ہو۔

یقیناً مقابلہ ہمیشہ کامل نہیں ہوتا۔ بعض ضابطے منڈی میں داخلے کو محدود کر دیتے ہیں۔ کوئی اجارہ دار جان بوجھ کر قلت برقرار رکھ کر قیمتیں بڑھا سکتا ہے۔ کبھی مسئلہ معلومات کا ہوتا ہے: مثال کے طور پر، کسی سستی تکنیک کا موجد کچھ عرصے تک غیر معمولی منافع کما تا رہ سکتا ہے، جب تک دوسرے لوگ وہی طریقہ سیکھ نہ لیں۔اسی لیے ''قدرتی قیمت''اور ''بازاری قیمت'' کے درمیان فرق پیدا ہو سکتا ہے۔

---

[25] ایضاً، کتاب اوّل، باب ہفتم۔

اجرتوں کا تعلق معاشی نمو سے

اسی طرح کی کمزوریاں محنت کی منڈی میں بھی ملتی ہیں۔ اگرچہ زمین، سرمایہ اور محنت ایک دوسرے پر منحصر ہوتے ہیں، مگر مزدوروں، آجرین اور زمینداروں کے درمیان طاقت کا توازن برابر نہیں ہوتا۔ اسمتھ کے مطابق آجر اکثر ایسے قوانین کو فروغ دیتے ہیں جو مزدوروں کے اتحاد یا مشترکہ سودے بازی کو روک دیں، حالانکہ خود آجرین کے درمیان ملی بھگت ''عام اور مسلسل'' رہتی ہے۔[26]

لیکن اسمتھ یہ بھی کہتا ہے کہ اجرتیں کم رکھنا معاشی طور پر دانشمندانہ حکمتِ عملی نہیں۔ بہتر اجرتیں اور بہتر کام کے حالات پیداواریت بڑھاتے ہیں، اور بالآخر منافع میں بھی اضافہ کرتے ہیں۔ اسمتھ کے نزدیک مزدوروں کے سب سے بڑے حامی دراصل قومی آمدنی میں اضافہ اور سرمائے کی بڑھوتری ہیں، کیونکہ یہی عوامل اجرتوں کو اوپر لے جاتے ہیں۔ جس زمیندار کے پاس زائد آمدنی ہو، وہ زیادہ خادم رکھے گا۔

جس بُنکر یا موچی کے پاس اضافی سرمایہ ہو، وہ معاون رکھ لے گا۔ دوسرے لفظوں میں محنت کی طلب اسی وقت بڑھتی ہے—اور صرف اسی وقت—جب قومی دولت بڑھ رہی ہو۔ اسمتھ کے نزدیک ''محنت کا فراخ دلانہ معاوضہ'' بنیادی طور پر معاشی نمو سے جڑا ہوا ہے۔ لیکن اسمتھ یہ بھی واضح کرتا ہے کہ اجرتوں کا اصل معیار یہ نہیں کہ رقم کتنی ہے، بلکہ یہ ہے کہ وہ رقم کتنی چیزیں خرید سکتی ہے۔ وہ توجہ دلاتا ہے کہ اگرچہ اس کے زمانے میں بعض ٹیکسوں کی وجہ سے موم بتیوں، چمڑے، شراب اور دوسری تعیشاتی چیزیں مہنگی ہو گئی تھیں، مگر خوراک اور دوسری بنیادی ضروریات منڈی کے نظام کے باعث نسبتاً سستی ہو رہی تھیں۔ اس کا فائدہ خاص طور پر غریب طبقے کو پہنچا۔ اسی سیاق میں اسمتھ کہتا ہے:

''کوئی معاشرہ یقیناً خوشحال اور خوش نہیں ہو سکتا جس کے افراد کی اکثریت غریب اور بدحال ہو۔[27]''

منڈی میں اجرتوں کی شرحیں کیوں مختلف ہوتی ہیں؟

نظری طور پر اسمتھ سمجھتا ہے کہ وقت کے ساتھ مختلف پیشوں کی آمدنیاں ایک دوسرے کے

---

[26] ایضاً، کتاب اوّل، باب ہشتم، صفحہ 84، پیرا گراف 13۔

[27] ایضاً، کتاب اوّل، باب ہشتم، صفحہ 96، پیرا گراف 36۔

قریب آجانی چاہییں۔ اگر کسی پیشے میں زیادہ معاوضہ ہو تو لوگ ادھر آجائیں گے، اور منڈی توازن پیدا کر دے گی۔ تو پھر حقیقت میں اجرتیں مختلف کیوں رہتی ہیں؟ اسمتھ کہتا ہے کہ صرف ''مالی'' معاوضہ نہیں دیکھنا چاہیے۔ غیر مالی فائدے اور نقصانات بھی اہم ہیں۔ کچھ کام سخت، گندے یا ناپسندیدہ ہوتے ہیں، اس لیے ان کی اجرت زیادہ ہو سکتی ہے۔ کچھ کام موسمی ہوتے ہیں (جیسے اینٹوں کا کام)۔

بعض پیشے ـــــ مثلاً طب ـــــ زیادہ معاوضہ اس لیے پاتے ہیں کہ ان میں عوامی اعتماد کی غیر معمولی ضرورت ہوتی ہے۔ کچھ شعبوں کی تعلیم و تربیت بہت مہنگی ہوتی ہے (مثلاً قانون)۔ اور بعض جگہ مہنگی تربیت کے باوجود کامیابی کے امکانات کم ہوتے ہیں (مثلاً اوپیرا گلوکار)۔ یہ سب عوامل مختلف پیشوں میں محنت کی ''بازاری قیمت'' کو متاثر کرتے ہیں۔

اجرتیں اور سیاست

لیکن آمدنی اور منافع پر سیاست اور قانون کا اثر بھی پڑتا ہے۔ بعض ضابطے لوگوں کو مخصوص پیشوں میں داخل ہونے سے روکتے ہیں۔ اسمتھ ایسے مقامی قوانین کی مثال دیتا ہے جو شیفیلڈ کے چھری سازوں کو ایک سے زیادہ شاگرد رکھنے سے منع کرتے ہیں، یا نارفوک کے بُنکروں اور انگلستان کے ٹوپی سازوں کو دو سے زیادہ شاگرد رکھنے کی اجازت نہیں دیتے۔

ایسی رکاوٹیں اُن چند افراد کی آمدنی تو بڑھا دیتی ہیں جو ''ماسٹر'' بننے کے معیار پر پورا اترتے ہیں، مگر اس کی قیمت دوسروں سے ان کی محنت کی ''مقدس ملکیت'' چھین کر ادا کی جاتی ہے۔ ساتھ ہی یہ پابندیاں مزدوروں کو زوال پذیر شعبوں سے ان شعبوں میں جانے سے بھی روکتی ہیں جہاں ان کی زیادہ ضرورت ہو۔ اسی تناظر میں اسمتھ کا مشہور جملہ آتا ہے:

''ایک ہی پیشے کے لوگ شاذ و نادر ہی محض تفریح کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں؛ ان کی گفتگو عموماً عوام کے خلاف کسی سازش پر ختم ہوتی ہے، یا قیمتیں بڑھانے کی کسی تدبیر پر۔[28]''

لیکن اسمتھ فوراً یہ بھی کہتا ہے کہ سیاست دان اور قانون بھی اکثر اس میں شریک ہوتے ہیں، کیونکہ وہ ایسے قواعد بنا دیتے ہیں جو اس ملی بھگت کو آسان اور مؤثر کر دیتے ہیں۔ اس کے نزدیک قرونِ وسطیٰ

---

[28] ایضاً، کتاب اوّل، باب دہم، حصہ دوم، صفحہ 145، پیرا گراف 27۔

سے قائم پیشہ ورانہ گلڈز (یا "کارپوریشنز") اسی قسم کے مراعات یافتہ ادارے تھے۔ یہ ادارے سخت پابندیاں لگاتے تھے کہ کون اس پیشے میں داخل ہو سکتا ہے، کن شرائط پر، اور کس کو کام کرنے کی اجازت ملے گی۔ وہ اپنے اراکین کی فہرستیں رکھتے تھے، اور چندہ جمع کر کے اپنے ہی غریب اراکین کے لیے فنڈز بھی بناتے تھے۔

اسمتھ کا کہنا ہے کہ جب قانون کسی پیشے کے افراد کا سرکاری رجسٹر بنا دے تو لوگوں کے لیے آپس میں رابطہ کرنا آسان ہو جاتا ہے، اور سازشی ملاقاتوں کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ اسی طرح لازمی فلاحی فنڈز بھی ایسے اجتماعات کو تقریباً ناگزیر بنا دیتے ہیں۔ اور اگر قانون اس سے آگے بڑھ کر پیشوں کو اکثریتی رائے کے ذریعے مشترکہ فیصلے کرنے کی اجازت دے دے، تو یہ "رضاکارانہ ملی بھگت" کے مقابلے میں مسابقت کو زیادہ مضبوطی اور زیادہ دیر تک محدود کر دیتا ہے۔[29]

آخر میں اسمتھ کے نزدیک کاروبار پر واحد "حقیقی اور مؤثر" نظم وضبط یہ ہے کہ گاہک ناراض ہو کر کاروبار چھوڑ سکتے ہیں۔[30] اسمتھ کے مطابق آزاد منڈی، جہاں صارف کے پاس انتخاب ہو، کاروباری رویّوں کو بہتر بنانے کا نسبتاً زیادہ قابلِ اعتماد طریقہ ہے، بنسبت اس کے کہ قواعد وضوابط کا ڈھیر لگا دیا جائے — کیونکہ یہ قواعد اکثر اپنے دعوے کے برعکس نتائج پیدا کر دیتے ہیں۔

سرمایہ اور منافع

اسی طرح کے بگڑے ہوئے اور الٹے ترغیبات پر مبنی ضابطے پیداوار کے اگلے عنصر کو بھی متاثر کرتے ہیں، جسے اسمتھ سرمایہ (stock) کہتا ہے۔[31] اس کے نزدیک "سرمایہ" صرف نقدی نہیں، بلکہ وہ تمام چیزیں ہیں جو پیداوار اور تجارت کو چلانے میں مدد دیتی ہیں۔ مثلاً[32]:

- وہ اشیا جو فوری استعمال کے لیے محفوظ رکھی جاتی ہیں، جیسے کپڑے یا خوراک کے ذخائر

---

[29] ایضاً، کتاب اوّل، باب دہم، حصہ دوم، صفحہ 145، پیرا گراف 30۔

[30] ایضاً، کتاب اوّل، باب دہم، حصہ دوم، صفحہ 146، پیرا گراف 31۔

[31] ایضاً، کتاب اوّل، باب دہم۔

[32] ایضاً، کتاب دوم، باب اوّل۔

- مستقل سرمایہ، جیسے مشینری اور اوزار
- گردشی سرمایہ، یعنی زیرِ تکمیل کام اور وہ تیار شدہ مال جو ابھی فروخت کے لیے پڑا ہو

اسمتھ یہ بھی بتاتا ہے کہ سرمایہ پر منافع ——یعنی پیداوار میں سرمایہ لگانے والوں کی آمدنی—— بہت غیر یقینی اور بدلتی رہتی ہے۔ یہ قیمتوں، مسابقت کرنے والوں کی کارکردگی، اور اُن ''ہزاروں حادثات'' پر منحصر ہوتی ہے جو ترسیل یا ذخیرہ کے دوران پیش آسکتے ہیں۔[33]

تاہم اسمتھ کے نزدیک شرحِ سود منافع کی ایک مجموعی علامت ہے۔ اگر لوگ قرض لینے کے لیے زیادہ شرحِ سود دینے پر آمادہ ہوں، تو اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ وہ قرض کی رقم کو پیداوار میں لگا کر اچھا منافع کمانے کی امید رکھتے ہیں۔ وضاحت کے لیے وہ امریکی نوآبادیات کی مثال دیتا ہے، جہاں زمین تو وافر تھی مگر اسے قابلِ کاشت بنانے کے لیے سرمایہ اور محنت نسبتاً کم۔ اس کے نتیجے میں زمین سستی، جبکہ سرمایہ اور محنت مہنگی ہو جاتی تھیں——اور یہی بات بلند منافع، بلند شرحِ سود اور بلند اجرتوں کی صورت میں نظر آتی تھی۔

زمین اور کرایہ

زمین اور کرایے کے بارے میں اسمتھ کی باتوں[34] سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زمینداروں پر بھی کم تنقید نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک زمیندار محنت یا پیداوار کے ذریعے نہیں، بلکہ محض زمین کی ملکیت، محلِ وقوع اور زرخیزی کی وجہ سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہ اسے ایک طرح کی اجارہ دارانہ قیمت (monopoly price) سے تشبیہ دیتا ہے۔ پھر جب امیر تاجر باوقار دیہی جاگیروں کے مالک بننے لگتے ہیں تو زمین کی طلب مزید بڑھتی ہے، اور اس کے نتیجے میں زمین کی قیمتیں اور کرایے اوپر چلے جاتے ہیں۔

اسمتھ یہ بھی یاد دلاتا ہے کہ زمین صرف خوراک یا جگہ ہی نہیں دیتی، بلکہ معدنیات بھی مہیا کرتی ہے۔ چاندی پر اس کی طویل ضمنی بحث میں وہ مختلف شواہد پیش کر کے یہ مؤقف مضبوط کرتا ہے کہ جیسے جیسے قومی آمدنی بڑھتی ہے، صنعتی مصنوعات نسبتاً سستی ہوتی جاتی ہیں، جبکہ زمین مہنگی ہوتی چلی جاتی ہے۔

---

[33] ایضاً، کتاب اوّل، باب نہم، صفحہ 105، پیراگراف 3۔

[34] ایضاً، کتاب اوّل، باب یازدہم۔

ایک خودکار نظام

خلاصہ یہ کہ کسی ملک کی سالانہ پیداوار بالآخر کرائے، اجرتوں اور منافع میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زمیندار، مزدور اور سرمایہ لگانے والے فطری طور پر ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں۔[35] یہ سب ایک ہی مربوط نظام کے حصے ہیں جس میں اشیا پیدا ہوتی ہیں، تبادلہ ہوتی ہیں، استعمال ہوتی ہیں اور دوبارہ پیدا کی جاتی ہیں—اور وسائل عموماً خود بخود وہاں منتقل ہونے لگتے ہیں جہاں ان کا استعمال زیادہ بہتر ہو۔

لیکن اس نظام کو مفاداتی گروہ بگاڑ بھی سکتے ہیں، جب وہ اپنے فائدے کے لیے حکومتی طاقت استعمال کر کے منڈی کے فطری عمل کو مسخ کر دیتے ہیں۔ زمیندار اکثر سست واقع ہو سکتے ہیں اور مزدور عموماً کمزور پوزیشن میں ہوتے ہیں، مگر اسمتھ کے مطابق آجر (کاروباری مالکان) کے پاس نہ صرف ترغیب ہوتی ہے بلکہ وہ صلاحیت بھی رکھتے ہیں کہ ایسے ضابطے آگے بڑھائیں جو مسابقت کو دبا دیں۔ اسی لیے وہ خبردار کرتا ہے:

''تجارت سے متعلق کسی بھی نئے قانون یا ضابطے کی تجویز، اگر اس طبقے کی جانب سے آئے، تو اسے ہمیشہ انتہائی احتیاط سے سنا جانا چاہیے... اور اسے اس وقت تک قبول نہیں کیا جانا چاہیے جب تک اس کا طویل اور باریک بینی سے جائزہ نہ لے لیا جائے—صرف دیانت داری سے ہی نہیں بلکہ شک کی نظر سے بھی۔[36]''

سرمائے کا ارتکاز

The Wealth of Nations کی دوسری کتاب سرمائے کے جمع ہونے سے متعلق ہے، جسے اسمتھ معاشی ترقی کی بنیادی شرط سمجھتا ہے۔ تبادلہ اور تقسیمِ محنت اضافی پیداوار (surplus) پیدا کرتے ہیں۔ یہ اضافی پیداوار پھر نئی مشینری، بہتر طریقوں اور زیادہ مؤثر پیداوار میں لگ سکتی ہے۔

---

[35] ایضاً، کتاب اوّل، باب یازدہم۔

[36] ایضاً، کتاب اوّل، باب یازدہم، صفحہ 267، پیراگراف 10۔

اس طرح ایک مثبت چکر بن جاتا ہے: پیداوار بڑھتی ہے، اضافی پیداوار بڑھتی ہے، سرمایہ کاری بڑھتی ہے، اور پھر پیداوار مزید بڑھتی ہے۔ اسمتھ کے نزدیک اس عمل کی وجہ سے خوشحالی ''پھیلتی ہوئی کیک'' کی طرح ہوسکتی ہے۔ ایک فرد یا قوم کی خوشحالی لازماً دوسرے کی غریبی کی قیمت پر نہیں ہوتی۔ جب مجموعی پیداوار بڑھتی ہے تو مجموعی طور پر سب کے لیے گنجائش بڑھتی ہے۔

پیسہ

اسمتھ کے مطابق پیسے کی اپنی کوئی اندرونی قدر نہیں ہوتی۔[37] یہ بنیادی طور پر تبادلے کا ذریعہ ہے۔ حقیقی دولت وہ ہے جو پیسے سے خریدی جاسکتی ہے، نہ کہ خود سکے یا نوٹ۔ آخر کار سونے اور چاندی کی قوتِ خرید بدلتی رہتی ہے۔ وہ ایک سادہ مثال دیتا ہے: آج ایک شخص کے ہاتھ آنے والا سکہ کل کسی دوسرے کی آمدنی بن سکتا ہے، پھر اگلے دن کسی تیسرے کی۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ گردش میں موجود پیسے کی مقدار قومی آمدنی کے برابر نہیں ہوتی۔ مرکنٹلسٹ اسی کو ایک سمجھ کر بنیادی غلطی کرتے ہیں۔

پھر بھی پیسے کے اثرات ضرور ہوتے ہیں۔ اگر پیسہ یونہی پڑا رہے تو یہ ایک بے کار آلہ بن جاتا ہے—جسے اسمتھ ''مردہ سرمایہ (dead stock)'' کہتا ہے۔ لیکن ایک مؤثر بینکاری نظام اسی پیسے کو زیادہ فعال بنا سکتا ہے۔ اسمتھ کے زمانے میں آج والا حکمی کاغذی کرنسی نظام موجود نہیں تھا۔ اس دور میں بینک عموماً سونے کے ذخائر کے بدلے نوٹ جاری کرتے تھے۔

اسمتھ کے خیال میں اس سے نقدی کو گردش میں رکھنا آسان ہو جاتا تھا، مگر وہ اس خطرے سے بھی آگاہ تھا کہ اگر بینک ضرورت سے زیادہ نوٹ جاری کریں تو بحران پیدا ہو سکتا ہے۔ وہ 1772 کے بینکاری بحران کے فوراً بعد لکھ رہا تھا، جب اسکاٹ لینڈ کے کئی بینک دیوالیہ ہو گئے تھے۔ وہ سمجھتا تھا کہ مسابقت کا دباؤ بینکوں کو محتاط رکھے گا، مگر اس کے باوجود وہ بعض بنیادی بینکاری ضوابط کو ضروری بھی سمجھتا تھا۔ (اسمتھ ہر ضابطے کے خلاف نہیں تھا؛ وہ صرف اس ضابطے کے خلاف تھا جو عمومی فلاح کے بجائے مخصوص مفادات کو بڑھائے)۔

---

[37] ایضاً، کتاب دوم، باب دوم۔

کھپت اور سرمایہ کاری

اسمتھ ایک اور اہم فرق قائم کرتا ہے : مجموعی آمدنی اور خالص آمدنی کے درمیان ـــــ یعنی کل آمدنی منہا وہ لاگت جو اسے حاصل کرنے میں آتی ہے۔[38] اس کے بعد وہ محنت کو ''پیداواری'' اور ''غیر پیداواری'' میں تقسیم کرتا ہے۔ پیداواری محنت وہ ہے جو اپنی لاگت سے زیادہ قدر پیدا کرے اور ایسا اضافی حصہ چھوڑے جسے دوبارہ سرمایہ کاری میں لگایا جا سکے ـــــ مثلاً کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور۔ غیر پیداواری محنت وہ ہے جس کا نتیجہ فوراً استعمال ہو جاتا ہے ـــــ مثلاً ڈاکٹر، موسیقار، وکیل یا سرکاری اہلکار کی خدمات۔

آج ہم اس فرق کو کچھ حد تک ''پیداواری شعبوں'' اور ''خدماتی شعبوں'' کے فرق سے سمجھ سکتے ہیں۔ (یہاں اسمتھ کی تقسیم سے مکمل اتفاق ضروری نہیں؛ مقصد یہ سمجھنا ہے کہ وہ ''سرمایہ بڑھانے'' کی صلاحیت پر زور دے رہا ہے)۔ اسمتھ کے مطابق اگر ہم آج بہت زیادہ کھپت کر لیں تو ہمارے پاس سرمائے کو سنبھالنے اور بڑھانے کے لیے کم بچتا ہے، اور اس سے آئندہ کی آمدنی اور معاشی نمو متاثر ہو سکتی ہے۔ ہم اتنی کھپت بھی کر سکتے ہیں کہ پیداواری صلاحیت بڑھانے کے لیے کچھ بچے ہی نہ ـــــ بلکہ اسے برقرار رکھنا بھی مشکل ہو جائے۔ اسمتھ اسے ''سرمایہ کھا جانے'' کے مترادف سمجھتا ہے۔

وہ فضول خرچ انسان کو یوں بیان کرتا ہے کہ وہ ''اپنے اخراجات کو اپنی آمدنی کی حدود میں مقید نہیں رکھتا'' اور ''کاہلی کی اجرت اُن رقوم سے ادا کرتا ہے جو سابقہ نسلوں کی کفایت شعاری نے صنعت کے فروغ کے لیے بچا رکھی تھیں۔[39]'' سرمایہ غلط فیصلوں کی وجہ سے بھی ضائع ہو سکتا ہے ـــــ جسے اسمتھ ''بدانتظامی (misconduct)'' کہتا ہے۔ اور اگر قانون کی حکمرانی کمزور ہو تو سرمایہ چوری بھی ہو سکتا ہے، جس سے لوگ سرے سے سرمایہ جمع کرنے کی ترغیب کھو بیٹھتے ہیں۔

---

[38] ایضاً، کتاب دوم، باب دوم۔

[39] ایضاً، کتاب دوم، باب دوم، صفحہ 339، پیرا گراف 20۔

اس کے باوجود اسمتھ کہتا ہے کہ ''بڑی قومیں کبھی نجی اسراف سے غریب نہیں ہوتیں... لیکن وہ بعض اوقات سرکاری اسراف اور بدانتظامی سے ضرور غریب ہو جاتی ہیں۔[40]'' عام لوگ جانتے ہیں کہ بچت اور سرمایہ کاری ضروری ہے، مگر حکومتیں اکثر سرمایہ محفوظ رکھنے کے بجائے موجودہ اخراجات میں زیادہ الجھی رہتی ہیں۔ اسی لیے اسمتھ بادشاہوں اور وزیروں پر سخت تنقید کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ اگر ریاست تباہ ہوتی ہے تو زیادہ امکان سرکاری فضول خرچی سے ہوتا ہے، نہ کہ عام لوگوں کی۔[41]

آخر میں وہ یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ منڈی پر مبنی معیشت مجموعی طور پر ایک مضبوط اور لچک دار نظام ہے۔ بڑی حکومتیں قوموں کو پیچھے تو دھکیل سکتی ہیں، مگر شاذ ہی انہیں مکمل طور پر روک پاتی ہیں۔ اسمتھ کے الفاظ میں:

''ہر انسان کی اپنی حالت بہتر بنانے کی یکساں، مسلسل اور بلا تعطل کوشش... اکثر اس قدر طاقتور ہوتی ہے کہ حکومت کی فضول خرچی اور انتظامیہ کی سنگین غلطیوں کے باوجود بھی حالات کے فطری بہاؤ کو بہتری کی سمت برقرار رکھتی ہے۔[42]''

سرمائے پر مزید غور

اسمتھ بتاتا ہے کہ سرمایہ مختلف انداز میں استعمال ہو سکتا ہے۔[43] کچھ سرمایہ براہِ راست اور فوری کھپت سے جڑا ہوتا ہے، جیسے ماہی گیری جیسی سرگرمیاں۔ کچھ سرمایہ پیداوار اور ترسیل میں لگتا ہے، جیسے مشینری، اوزار، خام مال، اور تیار شدہ مال کی نقل و حمل۔

---

[40] ایضاً، کتاب دوم، باب سوم، صفحہ 342، پیرا گراف 30۔

[41] ایضاً، کتاب دوم، باب سوم، صفحہ 346، پیرا گراف 36۔

[42] ایضاً، کتاب دوم، باب سوم، صفحہ 343، پیرا گراف 31۔

[43] ایضاً، کتاب دوم، باب پنجم۔

اور پھر ایک تیسری قسم ہے جسے لوگ اکثر کم اہم سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ وہ اتنی ہی ضروری اور پیداواری ہے: تجارتی یا خوردہ سرمایہ۔ یہی سرمایہ اشیا کو چھوٹے، قابلِ استعمال حصوں میں تقسیم کر کے عام آدمی کی زندگی آسان بناتا ہے۔ ورنہ جب ہمیں گوشت چاہیے ہو تو ہمیں پورا بیل خریدنا پڑے۔

اسی نکتے سے اسمتھ ایک دلچسپ ضمنی بات کی طرف جاتا ہے۔ وہ اُن سرکاری اقدامات پر طنز کرتا ہے جو کسی علاقے میں خوردہ فروشوں کی تعداد محدود کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مثلاً شراب خانوں کو لائسنس دے کر کم کرنا۔ اس کے مطابق:

''نشہ نوشی کا رجحان عمومی طور پر شراب خانوں کی کثرت سے پیدا نہیں ہوتا، بلکہ یہی رجحان لازماً شراب خانوں کی کثرت کو روزگار فراہم کرتا ہے۔''[44]

یعنی خوردہ تجارتیں بھی باقی تجارتوں کی طرح بنیادی طور پر طلب کے تابع رہتی ہیں۔ کتاب دوم کا بنیادی پیغام یہ ہے کہ اگر ہم اپنی پیداوار کا کچھ حصہ فوری خرچ کرنے کے بجائے بچت کریں تو ہم اپنے پیداواری سرمائے میں اضافہ کر سکتے ہیں، اور یہی اضافہ آگے چل کر مزید پیداوار کا ذریعہ بنتا ہے۔ یہ خوشحالی کا پھیلتا ہوا دائرہ ہے، اور اس کا ہمارے بینکوں کے تہہ خانوں میں پڑی دھات کی مقدار سے کوئی تعلق نہیں۔

جب سرمایہ بڑھتا ہے تو تخصص اور محنت بچانے والے طریقے بھی بڑھتے ہیں۔ تقسیمِ محنت مزید گہری ہوتی ہے، اور اس کے نتیجے میں، جیسا کہ اسمتھ کہتا ہے، مزید محنت کی ضرورت پڑتی ہے۔ یوں جیسے جیسے سرمایہ پھیلتا ہے، اجرتیں بھی بڑھتی ہیں۔ (اسمتھ اس وقت لکھ رہا تھا جب صنعتی انقلاب اپنی پوری شدت میں سامنے نہیں آیا تھا، اور معیشت میں دستی محنت کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ وہ غالباً یہ تصور نہیں کرتا تھا کہ مشینیں خود محنت کی جگہ لے لیں گی)۔

اسمتھ کا مجموعی دعویٰ یہ ہے کہ منڈی پر مبنی معیشت قومی دولت بڑھانے میں غیر معمولی صلاحیت رکھتی ہے، اور اس سے پیدا ہونے والی خوشحالی بالآخر غریب ترین محنت کشوں تک بھی پہنچتی

---

[44] ایضاً، کتاب دوم، باب پنجم، صفحہ 360، پیرا گراف 7۔

ہے۔ اس کے نزدیک خوشحال ملک میں رہنے والا ایک غریب آدمی بھی عموماً اس غریب ملک کے امیر آدمی سے بہتر زندگی گزارتا ہے جہاں یہ نظام کمزور ہو۔

یہی بات عالمگیریت کی بنیادی منطق سے بھی جڑتی ہے: ممالک اُس وقت بہتر ہوتے ہیں جب وہ خود کفالت پر اصرار نہ کریں اور دوسروں کے خلاف تجارتی رکاوٹیں کھڑی نہ کریں۔

معاشی اداروں کی تاریخ

کتاب سوم میں اسمتھ معاشی تعلقات کے ارتقا پر گفتگو کرتا ہے، کبھی تاریخی قیاس سے اور کبھی ٹھوس شواہد کے ذریعے۔ وہ زراعت سے صنعت کی طرف رفتہ رفتہ بڑھنے والی پیش رفت بیان کرتا ہے۔ اس کے مطابق شہروں کی ترقی، اور شہروں اور دیہی علاقوں کا باہمی انحصار، ایک فطری عمل ہے۔ کاریگروں کو خوراک کے لیے کسانوں کی ضرورت ہوتی ہے، جبکہ کسانوں کو اوزار بنانے کے لیے کاریگروں کی، اور اپنی پیداوار بیچنے کے لیے شہروں اور منڈیوں کی۔ شہر جتنا بڑا ہوتا ہے، منڈی بھی اتنی ہی وسیع ہوتی ہے۔

اسمتھ اُس زمانے کے فرانسیسی ''فزیوکریٹ'' ماہرینِ معیشت سے اختلاف کرتا ہے جو یہ سمجھتے تھے کہ شہر محض دیہات کے وسائل پر پلتے ہیں۔ اسمتھ کے نزدیک حقیقت یہ ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کو خدمات فراہم کر کے قدر میں اضافہ کرتے ہیں۔ اسمتھ یورپ میں جاگیردارانہ نظام کے زوال کا بھی نقشہ کھینچتا ہے۔ وہ رومی سلطنت کے سقوط کے بعد جاگیردارانہ قانون کی ابتدا دیکھتا ہے، اور پھر بتاتا ہے کہ کس طرح تجارت نے بالآخر اس نظام کی جگہ لے لی۔[45]

اس کے خیال میں تجارت اور تبادلے کے دور سے پہلے دولت بڑے زمینداروں کے پاس مرتکز تھی، اور یہی دولت انہیں مقامی سیاسی اور قانونی اختیار بھی دیتی تھی۔ لیکن یہ اختیار اکثر من مانی تھا۔ جاگیردارانہ قانون گویا اسی من مانی طاقت کو کسی حد تک قابو میں لانے کی کوشش تھا، اگرچہ یہ کوشش مکمل کامیاب نہ ہو سکی۔

---

[45] ایضاً، کتاب سوم، باب چہارم۔

پھر تجارت اور کاروبار کے پھیلاؤ کے ساتھ زمینداروں کی دولت اور طاقت کمزور ہونے لگی۔ ان کے زیرِ سایہ رہنے والے افراد آہستہ آہستہ زیادہ خود مختار کاشتکار بن گئے۔ ان نئے آزاد کسانوں کو تحفظ اور استحکام کی ضرورت تھی۔ یوں جاگیر دارانہ نظام کی جگہ بتدریج ایسا قانون قائم ہونے لگا جو بڑے اور چھوٹے، طاقتور اور کمزور سب پر یکساں طور پر لاگو ہو۔

اسمتھ کے نزدیک تجارت کے عروج نے معاشی طاقت کو سیاسی طاقت سے الگ کر دیا، اور معاشی طاقت خود بھی ایک نہایت مؤثر قوت ہے۔ وہ اسے خوش آئند نتیجہ سمجھتا ہے، کیونکہ اس نے سرمائے کو بہتر تحفظ دیا اور انصاف کے سائے میں تجارت، کاروبار اور صنعت کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ ایک بار پھر اسمتھ وہی نکتہ دہراتا ہے کہ ایک فائدہ مند سماجی نتیجہ اکثر اُن لوگوں کے عمل سے بھی پیدا ہو جاتا ہے جن کا مقصد عوامی خدمت نہیں ہوتا، بلکہ وہ صرف اپنی جائیداد اور ذاتی تحفظ کے بارے میں فکر مند ہوتے ہیں۔

اقتصادی نظریہ اور پالیسی

کتاب چہارم میں اسمتھ ریاستی معاشی مداخلت پر اپنی تنقید کو منظم انداز میں پیش کرتا ہے۔ وہ مرکنٹیلزم سے آغاز کرتا ہے، اس غلط تصور کو رد کرتا ہے کہ دولت اور پیسہ ایک ہی چیز ہیں، اور پھر اُس پالیسی کو بھی نشانہ بناتا ہے جس کے تحت درآمدات کو محدود اور برآمدات کو بڑھایا جاتا ہے تاکہ سونا اور چاندی زیادہ سے زیادہ ملک میں روکی جا سکے۔[46]

مرکنٹیلزم اور پیسہ

اسمتھ یاد دلاتا ہے کہ پیسہ محض لین دین آسان بنانے کا ذریعہ ہے۔ چونکہ غیر ملکی تجارت مجموعی تجارت کا نسبتاً چھوٹا حصہ ہوتی ہے، اس لیے سونے کی سرحد پار آمد و رفت کسی بڑی قوم کو تباہ کر دے، یہ امکان بہت کم ہے۔ مرکنٹلسٹ کہتے ہیں کہ سونا پائیدار شے ہے، اور وہ ممالک جو ہمیں اشیا بیچتے

[46] ایضاً، کتاب چہارم، باب اوّل۔

ہیں، برسوں میں اسے جمع کرتے چلے جاتے ہیں، جبکہ ہم فانی اشیا کے بدلے پائیدار دھات دے کر نقصان اٹھاتے ہیں۔

اسمتھ اس کے جواب میں کہتا ہے: ہم خوشی سے فرانس سے شراب درآمد کرتے ہیں اور اس کے بدلے دھاتی سامان برآمد کرتے ہیں۔ مگر فرانسیسی اتنے ناسمجھ نہیں کہ وہ ضرورت سے زیادہ برتن اور اوزار جمع کرتے رہیں، اور نہ ہی ہمیں یہ کرنا چاہیے کہ سونا اور چاندی اتنی مقدار میں ذخیرہ کرتے جائیں جو ہماری ضرورت سے بڑھ جائے۔ اسمتھ کے نزدیک بے کار پڑی ہوئی دھات دراصل **مردہ سرمایہ** ہے، اور مردہ سرمایہ کسی قوم کو امیر نہیں بناتا۔

مطلق برتری

اسمتھ کے مطابق اگر ہم اپنے سونے اور چاندی کو بچانے کے خیال سے درآمدات پر پابندیاں لگاتے ہیں تو ہم اپنے ہی صارفین کے انتخاب محدود کر دیتے ہیں۔ پھر انہیں غیر ملکی پیدا کنندگان کی وسیع رینج کے بجائے مقامی پیدا کنندگان سے خریدنا پڑتا ہے، چاہے مقامی چیز مہنگی ہو یا کم معیار کی۔ یہ پالیسی مہنگی بھی ہوتی ہے اور نتیجہ خیز بھی نہیں رہتی۔[47]

جیسے مختلف پیشوں کے درمیان محنت کی تقسیم فائدہ دیتی ہے، ویسے ہی ممالک کو بھی وہ کام کرنا چاہیے جس میں وہ بہتر ہوں، اور پھر اپنی زائد پیداوار کا تبادلہ کر لینا چاہیے۔ یہ دلیل اُس اصول کی ابتدائی شکل ہے جسے آج ''مطلق برتری'' کہا جاتا ہے۔ اسمتھ اس بات کو ایک واضح مثال سے سمجھاتا ہے: اسکاٹ لینڈ میں شیشوں اور گرم خانوں کے ذریعے انگور اگائے جا سکتے ہیں اور شراب بھی بن سکتی ہے، لیکن اس لاگت پر جو باہر سے اتنی ہی اچھی شراب منگوانے کے مقابلے میں تقریباً تیس گنا زیادہ ہے۔ پھر کیا یہ معقول ہوگا کہ صرف اسکاٹ لینڈ میں کلیریٹ اور برگنڈی بنانے کی حوصلہ افزائی کے لیے غیر ملکی شراب کی درآمد پر پابندی لگا دی جائے؟[48]

---

[47] ایضاً، کتاب چہارم، باب دوم۔

[48] ایضاً، کتاب چہارم، باب دوم، صفحہ 458، پیراگراف 15۔

اسمتھ کے نزدیک اس قسم کی مداخلت غیر معقول اور مہنگی تو ہے ہی، اخلاقی طور پر بھی بگاڑ پیدا کرتی ہے۔ کیونکہ جو حکمران نجی افراد کو یہ بتانے لگے کہ وہ اپنا سرمایہ کس طرح استعمال کریں، وہ اپنے ہاتھ میں ایک ایسا اختیار لے آتا ہے جو کسی ایک فرد یا کسی ادارے کے لیے بھی محفوظ نہیں، خاص طور پر اس شخص کے لیے جو خود کو اس اختیار کے استعمال کے قابل سمجھ بیٹھے۔[49]

محصولات اور سبسڈیز

اسمتھ یہ مانتا ہے کہ بعض حالات میں عارضی محصولات (ٹیرف) کا جواز ہو سکتا ہے، مثلاً اس امید پر کہ دوسرے ممالک بھی اپنے محصولات کم کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ مگر عمومی طور پر ایسی پالیسیاں یا تو بے معنی ثابت ہوتی ہیں یا نقصان دہ۔ اور جو لوگ انہیں بہت زور سے آگے بڑھاتے ہیں، اُن کے بارے میں احتیاط ضروری ہے۔ مثال کے طور پر غیر ملکی شراب اور بیئر پر برطانوی محصولات کا دفاع اس بنیاد پر کیا جاتا تھا کہ اس سے نشے کی عادت کم ہو گی۔ اسمتھ جواب دیتا ہے کہ اگرچہ شراب کا غلط استعمال ہوتا ہے، پھر بھی یہ بہتر ہے کہ ہم اسے اُس لاگت سے سستا خرید سکیں جس لاگت پر ہم خود اسے تیار کریں۔

وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ ایسے محصولات فرانس کے مقابلے میں پرتگال کے حق میں چلے جاتے ہیں، اس دلیل پر کہ پرتگال برطانوی مصنوعات کا بہتر خریدار ہے۔ اسمتھ اس پر شکوہ کرتا ہے کہ چھوٹے درجے کے تاجروں کی خفیہ چالاکیاں بعض اوقات ایک عظیم سلطنت کی حکمرانی کے اصول بن جاتی ہیں۔[50] اسمتھ مرکنٹلسٹوں کو یہ بھی سمجھاتا ہے کہ تجارتی خسارے سے ہر حال میں گھبرانا ضروری نہیں۔ اگر کوئی ملک اپنی کھپت سے زیادہ پیداوار کر رہا ہے تو وہ بچت بھی کر رہا ہے اور اپنے سرمائے میں اضافہ بھی۔ ایسا ملک بعض اوقات برآمدات سے زیادہ درآمدات رکھنے کے باوجود بھی مجموعی طور پر خوشحال ہو سکتا ہے، اگر اس کی مجموعی پیداوار اور بچت بڑھ رہی ہو۔

---

[49] ایضاً، کتاب چہارم، باب دوم، صفحہ 456، پیراگراف 10۔

[50] ایضاً، کتاب چہارم، باب سوم، حصہ دوم، صفحہ 493، پیراگراف c8۔

دیگر تجارتی مداخلتوں، مثلاً برآمد کنندگان کے لیے ٹیکس میں رعایت (drawbacks)اور سبسڈیز (bounties)[51] پر اسمتھ کی بحث اُس زمانے کی دلچسپ جھلک بھی دیتی ہے اور کئی معنی خیز نکات بھی۔ مثال کے طور پر وہ سفید ہرنگ مچھلی کے شکار پر دی جانے والی باؤنٹی پر تنقید کرتا ہے کہ وہ دراصل ''ٹنّیج باؤنٹی'' ہے، یعنی جہاز کی محنت یا شکار میں کامیابی کے بجائے اس کے وزن کے حساب سے دی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ جہاز مچھلی پکڑنے کے لیے نہیں بلکہ باؤنٹی لینے کے مقصد سے تیار کیے جائیں۔[52]

نوآبادیاتی تجارت پر پابندیاں

دی ویلتھ آف نیشنز کی اشاعت کے چند ہی ماہ بعد امریکا کی دبی ہوئی ناراضگیاں کھلی بغاوت میں بدل گئیں۔ نوآبادیات پر اسمتھ کا باب[53] اس بات کا صاف ثبوت ہے کہ وہ امریکیوں کے ساتھ ہمدردی رکھتا تھا۔ اس کی ایک وجہ مرکنٹلسٹ پابندیاں تھیں جنہوں نے امریکی تجارت کو نقصان پہنچایا—اور اس عمل میں برطانیہ کو بھی کوئی حقیقی فائدہ نہ ہوا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اسمتھ کے نزدیک اگر امریکا سے ٹیکس وصول کیے جا رہے ہیں تو انصاف کا تقاضا ہے کہ پارلیمنٹ میں اسے زیادہ نمائندگی بھی ملے۔

نوآبادیات کی ابتدا پر بات کرتے ہوئے اسمتھ یہ بھی کہتا ہے کہ اکثر نوآبادیات سونا یا چاندی تلاش کرنے کی امید میں قائم کی جاتی ہیں، کیونکہ مرکنٹلسٹ سوچ میں یہی دولت سمجھی جاتی تھی۔ مگر امریکا کا اصل اثاثہ دھاتیں نہیں، زمین ہے۔ زمین وافر، نسبتاً سستی، اور بہت زرخیز تھی—لیکن اسے حقیقی پیداوار میں بدلنے کے لیے بڑی مقدار میں محنت درکار تھی۔ اسی لیے مزدوری وہاں مہنگی تھی، مگر امریکی زراعت اتنی زیادہ پیداواری تھی کہ یہ مہنگی محنت بھی قابلِ برداشت رہتی تھی۔ اسمتھ کے نزدیک امریکا اس قدر زرخیز اور مالامال تھا کہ برطانیہ کے ٹیکسوں اور تجارتی پابندیوں نے بھی (کم از کم اُس وقت تک) اسے تباہ نہیں کیا تھا۔

---

[51] ایضاً، کتاب چہارم، ابواب چہارم اور پنجم۔

[52] ایضاً، کتاب چہارم، باب پنجم، صفحہ 520، پیرا گراف 32۔

[53] ایضاً، کتاب چہارم، باب ہفتم۔

برطانیہ کی پالیسی نے دونوں کو نقصان پہنچایا

اسمتھ کے مطابق امریکا کو صرف مادرِ وطن کے ساتھ تجارت پر مجبور کرنے والی پالیسی نے برطانیہ کے سرمائے اور کاروباری صلاحیت کو زیادہ مفید سمتوں سے ہٹادیا۔ اس سے نہ صرف امریکا بلکہ خود برطانیہ کی خوشحالی بھی متاثر ہوئی۔ سرمایہ جمع ہونے کی رفتار سست پڑ گئی، اور نتیجتاً دونوں کی مستقبل کی آمدنی کم ہونے لگی۔

اسمتھ کے الفاظ میں برطانیہ نے امریکا کو ''محض صارفین کی ایک قوم'' بنانے کی کوشش کی، مگر اس پالیسی نے انہیں کسانوں کے بجائے سیاست دان بنادیا۔ مزید یہ کہ چونکہ برطانوی صنعت کا ایک بڑا حصہ بحرِ اوقیانوس کے پار تجارت پر کھڑا تھا، اس لیے سیاسی خطرات بھی بڑھ گئے۔ اس خطرے کو کم کرنے کا واحد راستہ زیادہ تجارتی اور سیاسی آزادی تھا، مگر سرمایہ کاری کا پورا نظام اس قدر بگڑ چکا تھا کہ مطلوبہ اصلاح بہت تکلیف دہ ثابت ہوتی۔

یہ سب مرکنٹلسٹ طرزِ فکر کی ایک اور مثال ہے جہاں پیدا کرنے والوں کے مفادات غالب آ جاتے ہیں۔ اسمتھ اسی جگہ ایک بنیادی اصول بیان کرتا ہے:

''پیداوار کا واحد مقصد اور غایت صرف کھپت ہے؛ اور پیدا کرنے والے کے مفاد کو بھی صرف اسی حد تک اہمیت دی جانی چاہیے جس حد تک وہ صارف کے مفاد کو فروغ دینے کے لیے ضروری ہو۔''[54]

لبرل متبادل

اسمتھ فرانسیسی فزیوکریٹس پر تنقید کرتا ہے کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ تمام قدر زمین اور زراعت سے پیدا ہوتی ہے، جبکہ شہر کے تاجر اور کاریگر محض دولت کو اِدھر اُدھر منتقل کرتے ہیں اور کوئی نئی قدر پیدا نہیں کرتے۔ اس کے برعکس اسمتھ کا کہنا ہے کہ شہری آبادی حقیقت میں پیداواری ہوتی ہے۔ وہ صرف سرمایہ استعمال نہیں کرتی بلکہ اسے دوبارہ پیدا بھی کرتی ہے اور برقرار بھی رکھتی ہے۔ لہٰذا یہ لوگ غیر پیداواری نہیں، بلکہ ''پیداواری ہاتھ'' ہیں۔

---

[54] ایضاً، کتاب چہارم، باب ہشتم، صفحہ 660، پیراگراف 49۔

اس کے باوجود اسمتھ فزیوکریٹس کے معاشی فلسفے کو مرکنٹلسٹ نظریے سے بہتر سمجھتا ہے، کیونکہ وہ دولت کو پیسے کے برابر نہیں سمجھتے اور پیداوار بڑھانے کے لیے تجارت کی آزادی کو مفید راستہ قرار دیتے ہیں۔ اسمتھ کے نزدیک منڈی پر مبنی معیشت اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ اگر آزادی مکمل بھی نہ ہو تب بھی کسی حد تک چلتی رہتی ہے۔ مگر آزاد نظام کی خاص خوبی یہ ہے کہ وہ خود بخود اپنا توازن ڈھونڈ لیتا ہے۔ اسمتھ کے الفاظ میں: ''قدرتی آزادی کا سادہ اور واضح نظام خود بخود قائم ہو جاتا ہے۔''

یعنی لوگوں کو اپنے ذاتی مفاد کے تحت کام کرنے کی آزادی دے دی جائے تو وہ اکثر غیر ارادی طور پر مجموعی مفاد کو بھی آگے بڑھا دیتے ہیں۔ کسی مرکزی ہدایت یا منصوبہ بندی کی ضرورت نہیں رہتی۔ اسی معنی میں اسمتھ لکھتا ہے:

''حاکمِ وقت ایک ایسی ذمہ داری سے مکمل طور پر سبکدوش ہو جاتا ہے جسے نبھانے کے لیے نہ کوئی انسانی دانائی کافی ہو سکتی ہے اور نہ ہی کوئی انسانی علم؛ یعنی نجی افراد کی صنعت پر نگرانی کرنا اور اسے اس سمت میں موڑنا جو معاشرے کے مجموعی مفاد کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہو۔''[55]

اسمتھ کے نزدیک یہ خوش آئند بات ہے، کیونکہ جو نظام وسائل کو زبردستی مخصوص سمت میں موڑنے کی کوشش کرتا ہے وہ اکثر اسی مقصد کو نقصان پہنچا دیتا ہے جسے وہ آگے بڑھانے کا دعویٰ کرتا ہے۔[56]

حکومت کا کردار

کتاب پنجم میں اسمتھ حکومت کے مناسب کردار پر بات کرتا ہے۔ وہ حکومت اور سرکاری اہلکاروں پر سخت تنقید ضرور کرتا ہے، مگر وہ مکمل ''حکومتی عدم مداخلت'' کا بھی حامی نہیں۔ اس کے نزدیک منڈی کی معیشت اسی وقت درست طور پر کام کرتی ہے جب بنیادی قواعد قائم ہوں—یعنی ملکیت محفوظ ہو، معاہدے معتبر ہوں، اور قانون سب پر یکساں لاگو ہو۔

---

[55] ایضاً، کتاب چہارم، باب نہم، صفحہ 687، پیراگراف 51۔

[56] ایضاً، کتاب چہارم، باب نہم، صفحہ 687، پیراگراف 50۔

اسی لیے انصاف کا قیام اور قانون کی بالادستی اس کے نزدیک بنیادی شرط ہے۔ دفاع بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ اگر ہماری ملکیت کسی بیرونی طاقت کے ہاتھوں چھن سکتی ہو تو ہماری حالت اس سے بہتر نہیں رہتی کہ ہمارے اپنے ہمسائے ہی اسے چھین لیں۔ لیکن اسمتھ بات یہیں نہیں روکتا۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ حکومت کا ایک کردار عوامی منصوبوں (public works) کی فراہمی اور تعلیم کے فروغ میں بھی ہونا چاہیے۔

دفاع

اسمتھ اندازہ کرتا ہے کہ شکار اور خوراک جمع کرنے والے معاشروں میں ہر شخص اپنی حفاظت خود کرتا ہے۔ چونکہ ان کے پاس بہت کم یا بالکل ملکیت نہیں ہوتی، اس لیے کسی مضبوط مرکزی اختیار کی ضرورت بھی زیادہ محسوس نہیں ہوتی۔

اس کے برعکس زرعی دور میں لوگ قیمتی املاک جمع کرنے لگتے ہیں—فصلیں، مویشی، اور زمین سے جڑا سامان۔ ان کی حفاظت ایک بڑی ترجیح بن جاتی ہے۔ تقسیمِ محنت کے اصول کے تحت ایک پیشہ ور فوج قائم ہوتی ہے۔ جن کے پاس زیادہ ملکیت ہوتی ہے انہیں اس سے زیادہ فائدہ پہنچتا ہے، مگر وہ سب کو دفاع میں حصہ ڈالنے پر مجبور کرتے ہیں تاکہ کوئی ''مفت فائدہ اٹھانے والا'' نہ بنے۔ یوں دفاع حکومت کا باقاعدہ فریضہ بن جاتا ہے۔

انصاف

انصاف کے معاملے میں بھی اسمتھ اسی قسم کی تاریخی منطق پیش کرتا ہے۔ جیسے جیسے معاشرہ تجارت اور تبادلے کی طرف بڑھتا ہے، جائیداد رکھنے والے لوگ خود کو اُن لوگوں سے محفوظ رکھنے کے لیے شہری حکومت قائم کرتے ہیں جن کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔ اسمتھ ایک تلخ مگر حقیقت پسندانہ مشاہدہ کرتا ہے: امیر کی خوشحالی غریب کے دل میں غصہ اور بے چینی پیدا کر سکتی ہے۔ ضرورت اور حسد کے دباؤ میں وہ اس

کی ملکیت پر ہاتھ ڈالنے پر آمادہ ہو سکتا ہے۔ اسی لیے اسمتھ لکھتا ہے کہ صرف شہری مجسٹریٹ کی پناہ میں ہی جائیداد کا مالک ـــــ جو برسوں یا نسلوں کی محنت کا نتیجہ ہو ـــــ ایک رات بھی اطمینان سے سو سکتا ہے۔[57]

وہ آگے بڑھ کر کہتا ہے کہ شہری حکومت، بڑی حد تک، اسی تصادم اور اسی عدم مساوات کی پیداوار ہے جو تجارتی معاشرے میں جنم لیتی ہے۔ یہ ایک فطری نتیجہ ہے اور کئی پہلوؤں سے مفید بھی، مگر کامل نہیں۔ اور چونکہ شہری حکومت کا بنیادی مقصد املاک کا تحفظ ہے، اس لیے حقیقتاً اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ حکومت اکثر امیروں کو غریبوں کے خلاف تحفظ فراہم کرتی ہے ـــــ یا جن کے پاس کچھ ہے انہیں اُن کے مقابلے میں سہارا دیتی ہے جن کے پاس کچھ نہیں۔[58]

اسمتھ کے نزدیک یہ حیرت کی بات نہیں کہ ایسی بنیادوں پر قائم ہونے والا حکومتی نظام خود بھی کئی لحاظ سے ناقص ہوتا ہے۔ ٹیکس لگانے کی طاقت حکومت کو وسائل تو فراہم کر دیتی ہے، مگر حکومت کے پاس اپنی املاک کو اس درجے کی مؤثر انداز میں چلانے کی وہ ترغیب نہیں ہوتی جو کسی نجی فرد کے پاس ہوتی ہے۔ اسی بات کو وہ شاہی زمینوں کی مثال سے واضح کرتا ہے:

''اگر شاہی زمینیں نجی ملکیت بن جاتیں تو چند ہی برسوں میں وہ بہتر طور پر سنور جاتیں اور زیادہ اچھی طرح کاشت کی جاتیں... اور وہ آمدن جو ریاست کو کسٹمز اور ایکسائز کے محصولات سے حاصل ہوتی ہے، لازماً عوام کی آمدن اور کھپت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جاتی۔''[59]

اس ترغیب کی کمی کو درست کرنا ضروری ہے: 'عوامی خدمات کبھی بھی اس سے بہتر طریقے سے انجام نہیں پاتیں کہ جب اُن کا اجرا اُن کے انجام دیے جانے کے نتیجے میں ملے، اور اسے اُنہیں انجام دینے میں برتی گئی محنت کے تناسب سے مقرر کیا جائے'۔[60]

عوامی تعمیرات اور ادارے

---

[57] ایضاً، کتاب پنجم، باب اوّل، حصہ دوم، صفحہ 710، پیرا گراف c2۔

[58] ایضاً، کتاب پنجم، باب اوّل، حصہ دوم، صفحہ 715، پیرا گراف 12۔

[59] ایضاً، کتاب پنجم، باب دوم، حصہ اوّل، صفحہ 824، پیرا گراف a18۔

[60] ایضاً، کتاب پنجم، باب اوّل، حصہ دوم، صفحہ 719، پیرا گراف 20۔

اسمتھ کے نزدیک حکومت کی تیسری ذمہ داری یہ ہے کہ وہ کچھ ایسی عوامی سہولتیں اور عوامی ادارے قائم کرے اور انہیں برقرار رکھے جنہیں بنانا اور چلانا کسی ایک فرد یا چند افراد کے لیے فائدہ مند نہیں ہوتا—یا کم از کم اتنا فائدہ مند نہیں کہ وہ اکیلے اس کی لاگت اٹھائیں۔[61]

اس میں وہ منصوبے شامل ہیں جو تجارت کو آسان بناتے ہیں—جیسے سڑکیں، پل اور بندرگاہیں—اور وہ تعلیمی ادارے بھی جو لوگوں کو سماجی اور معاشی نظام میں زیادہ مؤثر اور مفید کردار ادا کرنے کے قابل بناتے ہیں۔

عوامی تعمیرات

اسمتھ کے مطابق خوشحالی کے لیے تجارت ضروری ہے، اور تجارت کے لیے ایسے ڈھانچے درکار ہوتے ہیں جو آمدورفت اور لین دین کو آسان بنائیں—سڑکیں، پل، بندرگاہیں وغیرہ۔ وہ کہتا ہے کہ بعض منصوبے ایسے ہوتے ہیں جو اپنی لاگت کبھی پوری نہیں کر سکتے، اس لیے انہیں ٹیکس کے ذریعے مالی مدد دینا پڑتی ہے۔ البتہ اسمتھ یہ بھی سمجھتا ہے کہ کم از کم کچھ حصہ ان لوگوں سے فیس یا ٹول کی صورت میں لیا جا سکتا ہے جو واقعی ان سہولتوں کو استعمال کرتے ہیں، بجائے اس کے کہ پورے ملک پر یکساں ٹیکس کا بوجھ ڈال دیا جائے۔

اسی طرح اگر کسی منصوبے کا فائدہ بنیادی طور پر مقامی ہو اور ٹول سے اس کی لاگت پوری نہ ہو سکتی ہو، تو پھر مقامی ٹیکس زیادہ مناسب ہے۔ مثال کے طور پر لندن کی سڑکوں کی پختگی اور اسٹریٹ لائٹس کے اخراجات لندن کے رہائشیوں اور کاروباریوں کو ہی برداشت کرنے چاہئیں۔ اسمتھ یہ بھی کہتا ہے کہ بعض اوقات حکومت کو نئی منڈیوں اور نئے تجارتی راستوں کی طرف لوگوں کو مائل کرنے کے لیے عارضی رعایتیں دینی چاہئیں۔ تاہم اس کے نزدیک یہ مدد عام ٹیکس دہندگان کی رقم سے دی جانے والی سبسڈی کی صورت میں نہیں ہونی چاہیے، بلکہ ایسی عارضی خصوصی مراعات کی شکل میں ہونی چاہیے جو ابتدائی خطرات کا کچھ ازالہ کر دیں—مثلاً پیٹنٹ یا کاپی رائٹ—تاکہ نئی کوششیں پنپ سکیں۔

---

[61] ایضاً، کتاب چہارم، باب اوّل، حصہ سوم، صفحہ 723، پیراگراف c1۔

چونکہ دی ویلتھ آف نیشنز اس مقام تک حکومتوں کی جانب سے عوام کے سرمائے کو ''ہدایت دینے'' کی مسلسل اور سخت تنقید کرتی رہی ہے، اس لیے یہ عوامی اخراجات سے متعلق تجاویز پہلی نظر میں کچھ عجیب محسوس ہوتی ہیں۔ یہ تو درست ہے کہ تجارت کو انصاف کے قواعد کی ضرورت ہوتی ہے، اور آمد و رفت کے لیے سڑکوں اور پلوں کی بھی۔ مگر پھر سوال یہ ہے کہ یہ سب سہولتیں نجی بنیادوں پر کیوں نہ بنیں؟

کیوں نہ سڑکوں، پلوں اور بندرگاہوں کی لاگت مکمل طور پر استعمال کرنے والوں سے فیس کے ذریعے وصول کر لی جائے؟ حتیٰ کہ سڑکوں کی مرمت اور روشنی کا بندوبست بھی مقامی کاروبار اپنے فائدے کے لیے کر سکتے ہیں۔ اور اگر نئے تجارتی راستے واقعی فائدہ مند ہیں تو پھر اس میں حکومت کی شمولیت کیوں ضروری ہو؟

شاید اس مقام پر اسمتھ کو اس بنیاد پر کچھ رعایت دی جا سکتی ہے کہ آج ہمارے پاس سرمایہ کاری اور مالی تعاون کے لیے بہت سے جدید ذرائع موجود ہیں، اور صارفین سے ادائیگیاں وصول کرنے کے لیے بھی بہتر ٹیکنالوجی ہے۔ لیکن اٹھارہویں صدی میں صورتِ حال مختلف تھی۔ اُس وقت حکومت کی مالی اعانت اور سرکاری پہل کو ہی اکثر ایسے کاموں کا واحد عملی راستہ سمجھا جاتا تھا جنہیں سب لوگ ضروری مانتے تھے۔

نوجوانوں کی تعلیم

اسمتھ بنیادی تعلیم کو بھی ایک طرح کی ضروری عوامی سہولت سمجھتا ہے، کیونکہ اس کے نزدیک یہ تجارت اور اجتماعی نظم کے لیے مددگار ہے۔ تاہم یہاں بھی اس کا تجزیہ اور تجاویز اس کی مجموعی فکر سے کچھ حد تک مختلف دکھائی دیتی ہیں۔ اسمتھ کا نقطۂ آغاز یہ ہے کہ تقسیمِ محنت اگرچہ پیداوار بڑھاتی ہے، مگر اس کے کچھ ناپسندیدہ سماجی اثرات بھی ہو سکتے ہیں۔ روزمرہ ایک ہی طرح کے محدود کام بار بار کرنے سے انسان کی دلچسپیوں اور سوچ کا دائرہ سکڑنے لگتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''وہ شخص جس کی پوری زندگی چند سادہ اعمال کی انجام دہی میں گزر جاتی ہے، جن کے نتائج بھی شاید ہمیشہ ایک جیسے ہوں یا تقریباً ایک جیسے ہوں، اسے نہ تو اپنی فہم و شعور کو استعمال کرنے کی

ضرورت پیش آتی ہے، اور نہ ہی اسے کسی نئی راہ یا تدبیر کی تلاش میں اپنی اختراعی صلاحیت کو بروئے کار لانا پڑتا ہے، کیونکہ ایسی مشکلات کبھی پیدا ہی نہیں ہوتیں جن کے حل کی ضرورت ہو۔"[62]

بعد میں مارکس اس کیفیت کو "بیگانگی" کا نام دے گا۔ اسمتھ کی رائے میں اس کا تدارک تعلیم کے ذریعے ضروری ہے۔ اسمتھ کے نزدیک تعلیم کا خاص ہدف محنت کش اور غریب طبقہ ہونا چاہیے، کیونکہ سب سے زیادہ اسی کو اس تنگ دائرۂ زندگی کا سامنا ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ تجارت اور روزگار کے لیے لوگوں کا پڑھنا، لکھنا اور حساب کرنا جاننا ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہندسہ اور میکانکس کا کچھ علم بھی فائدہ مند ہو سکتا ہے۔

اسمتھ کے مطابق مقامی سطح پر اسکول قائم کیے جا سکتے ہیں—— بالکل ویسے ہی جیسے کرکالڈی کا وہ سرکاری اسکول جہاں اس نے خود تعلیم حاصل کی تھی۔ تاہم وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اگرچہ ریاست کو اسکول کی عمارت اور بنیادی انتظامات کا خرچ اٹھانا چاہیے، لیکن اساتذہ کی پوری تنخواہ ریاست کے ذمے نہ ہو۔ اگر استاد کی آمدنی کا کچھ حصہ طلبہ کی فیسوں سے جڑا ہو تو اس کی کارکردگی بہتر رہتی ہے۔

وہ آکسفورڈ کے اپنے تجربے کو جھنجھلاہٹ کے ساتھ یاد کرتا ہے، جہاں اس کے مطابق:

"اسکولوں اور کالجوں کے اوقاف نے لازمی طور پر اساتذہ کی محنت اور توجہ کی ضرورت کو کسی نہ کسی حد تک کم کر دیا ہے۔ ان کا گزر بسر اپنی پیشہ ورانہ کامیابی اور شہرت سے بالکل آزاد ہو چکی ہے۔"[63]

اسمتھ واضح طور پر یہ نہیں بتاتا کہ بنیادی تعلیم کے لیے حکومت کو آخر کتنی مالی معاونت دینی چاہیے۔ وہ البتہ تلوار بازی یا رقص جیسی مہارتوں کے لیے قائم نجی اسکولوں کی تعریف کرتا ہے جہاں طلبہ پوری فیس ادا کرتے ہیں۔ یہی بات ایک جدید قاری کے ذہن میں یہ سوال پیدا کر سکتی ہے کہ اسکولوں کو براہِ راست سبسڈی دینے کے بجائے کیا ضرورت مند طلبہ کی مالی مدد کرنا زیادہ مؤثر نہیں ہوگا؟

تمام عمروں کے لیے تعلیم

اسمتھ بالغوں کی تعلیم اور مذہبی تعلیم کے بارے میں بھی حکومت کے لیے ایک کردار دیکھتا ہے۔

---

[62] ایضاً، کتاب پنجم، باب اوّل، حصہ سوم، صفحہ 782، پیراگراف f50۔

[63] ایضاً، کتاب پنجم، باب اوّل، حصہ سوم، مضمون دوم، صفحہ 760، پیراگراف f5۔

اس کے مطابق جب پادریوں کی تنخواہیں عشر سے طے ہو جائیں تو اکثر ان میں محنت اور ذمے داری کا جذبہ کمزور پڑ جاتا ہے۔ دوسری طرف، بڑھتے ہوئے شہروں کی مصروف اور رنگا رنگ زندگی میں اخلاقی اور مذہبی تربیت کی ضرورت پہلے سے زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ اسی لیے اسمتھ کم از کم اتنا ضرور چاہتا ہے کہ حکومت سائنس، فلسفہ اور فنون کے مطالعے کی حوصلہ افزائی کرے — اگرچہ وہ یہاں بھی تفصیل میں نہیں جاتا۔

وہ یہ بھی کہتا ہے کہ جس طرح حکومت کا کام ہے کہ وہ متعدی اور نقصان دہ بیماریوں کے پھیلاؤ کو روکے، اسی طرح اسے بزدلی اور خوف کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ایک قسم کی ''ذہنی کمزوری'' کے علاج پر بھی سنجیدگی سے توجہ دینی چاہیے۔[64]

فرماں روا

اسمتھ کے نزدیک ٹیکس سے پورا کیے جانے والے اخراجات میں ایک آخری مد ''فرماں روا کی شان و وقار'' کی نگہداشت ہے، جس میں بادشاہت کے اخراجات اور فوجداری انصاف کا نظام شامل ہوتا ہے۔ تاہم وہ یہ رائے بھی رکھتا ہے کہ دیوانی مقدمات کے کئی اخراجات فریقین کو ہی اٹھانے چاہئیں، کیونکہ براہِ راست فائدہ زیادہ تر انہی کو ہوتا ہے۔

ٹیکس کے اصول

یہ واضح کرنے کے بعد کہ کچھ نہ کچھ ٹیکس ناگزیر ہے، اسمتھ اس سوال کی طرف آتا ہے کہ ٹیکس وصولی کا بہتر طریقہ کیا ہے۔ یہاں وہ زیادہ مضبوط اور مانوس میدان میں نظر آتا ہے۔ وہ اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہے کہ:

''کوئی ایسا ہنر نہیں جسے ایک حکومت دوسری حکومت سے اتنی تیزی سے سیکھ لیتی ہو جتنا عوام کی جیبوں سے پیسہ نکالنے کا فن۔''[65]

---

[64] ایضاً، کتاب پنجم، باب اوّل، حصہ سوم، مضمون دوم، صفحات 787–788، پیرا گراف f60۔

[65] ایضاً، کتاب پنجم، باب دوم، حصہ دوم، مضامین اوّل اور دوم کے ضمیمہ میں، صفحہ 861، پیرا گراف h12۔

اسی تناظر میں وہ ٹیکس کے چار مشہور اصول پیش کرتا ہے[66]:

1. **آمدنی کے مطابق ٹیکس** :لوگوں کو ریاست کے تحفظ میں جتنی آمدنی ملتی ہے، اسی تناسب سے ٹیکس دینا چاہیے۔
2. **یقین اور شفافیت** : ٹیکس واضح اور طے شدہ ہو، ٹیکس افسر کے من مانے فیصلوں پر نہ چلے۔
3. **آسان ادائیگی** : ٹیکس کی ادائیگی عوام کے لیے بلاوجہ مشکل یا تکلیف دہ نہ ہو۔
4. **کم سے کم نقصان** : ٹیکس کا نظام کم خرچ ہو، کاروبار اور صنعت میں رکاوٹ نہ ڈالے، اور لوگوں کو غیر قانونی راستوں (جیسے اسمگلنگ) کی طرف نہ دھکیلے۔ اسی میں یہ بات بھی شامل ہے کہ شہریوں کو بار بار ٹیکس والوں کے پاس چکر نہ لگانے پڑیں اور غیر ضروری پوچھ گچھ یا تفتیش کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

اسمتھ کے نزدیک ٹیکسیشن وہ میدان ہے جہاں حکومت کی غلطی بہت مہنگی پڑ سکتی ہے۔ مثال کے طور پر وہ کمپنیوں پر ٹیکس لگانے کو دانشمندانہ قدم نہیں سمجھتا، کیونکہ — جیسا کہ وہ بڑی بصیرت سے کہتا ہے — سرمایہ بہت تیزی سے جگہ بدل سکتا ہے:

''سرمایہ کا مالک درحقیقت دنیا کا شہری ہوتا ہے اور ضروری نہیں کہ وہ کسی ایک خاص ملک سے وابستہ ہو۔ اگر اسے کسی ایسے ملک میں پریشان کن پوچھ گچھ اور بھاری ٹیکس کا سامنا ہو، تو غالب امکان ہے کہ وہ اس ملک کو چھوڑ دے۔ وہ اپنا سرمایہ کسی دوسرے ملک میں منتقل کر دے گا جہاں وہ یا تو اپنا کاروبار زیادہ آسانی سے چلا سکے، یا کم جھنجھٹ کے ساتھ اپنی دولت سے فائدہ اٹھا سکے۔''[67]

یہاں بھی اسمتھ کی رائے میں کچھ جگہوں پر تضاد دکھائی دیتا ہے۔ وہ عام کھپت (یعنی روزمرہ استعمال) پر ٹیکس کی مخالفت کرتا ہے، مگر عیش و عشرت کی چیزوں پر ٹیکس کی حمایت کرتا ہے — اور ان

---

[66] ایضاً، کتاب پنجم، باب دوم، حصہ دوم، صفحہ 827، پیرا گراف b6 ۔

[67] ایضاً، کتاب پنجم، باب دوم، مضمون دوم، صفحات 848–849، پیرا گراف f8 ۔

میں وہ چیزیں بھی شامل کر دیتا ہے جنہیں آج ہم خاصی بنیادی سمجھتے ہیں، مثلاً مرغی۔ اسی طرح وہ ایک طرف تو کہتا ہے کہ ٹیکس آمدنی کے تناسب سے ہونا چاہیے، مگر ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ امیروں کو اس تناسب سے ''کچھ زیادہ'' ادا کرنا چاہیے۔

عوامی قرضے

اگرچہ حکومت کے کردار پر اسمتھ کی بعض باتیں اس کے عمومی اصولوں سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں لگتیں، مگر اختتام پر وہ دوبارہ اپنے مضبوط اور صاف لہجے میں لوٹ آتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حکومتوں میں یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ وہ عوام سے جتنا نکال سکتی ہیں، اس سے بھی زیادہ خرچ کر ڈالتی ہیں۔ اسی لیے دی ویلتھ آف نیشنز کا اختتام وہ ایک سخت تنبیہ پر کرتا ہے : بڑا قومی قرض خطرناک ہوتا ہے۔[68]

قرض لے کر حکومت سرمایہ کو سرمایہ کاری اور معاشی ترقی سے ہٹا کر موجودہ خرچ کی طرف لے آتی ہے—یعنی ایسے اخراجات کی طرف جو حکومتی سرگرمیوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ترقی کی رفتار سست پڑ جاتی ہے۔ مزید یہ کہ سرکاری قرض حکمرانوں کو یہ سہولت بھی دیتا ہے کہ وہ عوام سے فوراً نئے ٹیکس مانگے بغیر اپنے اختیارات اور اخراجات بڑھا لیں۔ اور اکثر قرض واپس کرنے سے بچنے کے راستے بھی نکل آتے ہیں۔

اسی لیے اسمتھ کے نزدیک قومی قرض محض ایک گروہ سے دوسرے گروہ کو وسائل منتقل کرنے کا ''بے ضرر'' معاملہ نہیں، بلکہ یہ **آزادی** کے لیے حقیقی خطرہ ہے—اور اسی وجہ سے خوشحالی کے لیے بھی۔

---

[68] ایضاً، کتاب پنجم، باب سوم۔

آج کی دنیا میں دی ویلتھ آف نیشنز

یقیناً اسمتھ کی دنیا ہماری دنیا سے بہت مختلف تھی، خصوصاً صنعتی انقلاب سے پہلے کی دنیا۔ وہ مشترکہ حصص والی کمپنیوں کے بارے میں بھی شکوک رکھتا تھا، جو آج کے سرمایہ دارانہ نظام کا بنیادی ستون سمجھی جاتی ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ ''مالکان کی ایک بہت بڑی تعداد'' ایسی کمپنیوں کو مستقل طور پر مؤثر انداز میں کنٹرول نہیں کر سکتی۔ ممکن ہے وہ کسی حد تک درست بھی ہو۔[69]

لیکن اسمتھ نے ٹریڈ یونینوں کے بڑھتے ہوئے اثر، صنعتی آلودگی، کاغذی/حکمی کرنسی کے نتیجے میں مہنگائی، اور کئی دوسرے جدید مسائل کی پیش گوئی نہیں کی تھی۔

اس کے باوجود، دی ویلتھ آف نیشنز ہمیں ایک طاقتور بنیادی بات سمجھاتی ہے: اگر لوگوں کو کام کرنے، تجارت کرنے، بچت کرنے اور سرمایہ کاری کی آزادی اور تحفظ ملے—اور یہ سب کسی مرکزی حکم دینے والے نظام کے بغیر—تو خوشحالی خود اپنا راستہ بنا لیتی ہے۔

آزاد معیشت ایک وسیع، لچکدار اور خود کو ڈھال لینے والا نظام ہے، جو اچانک آنے والی تبدیلیوں کو سہنے اور نئے چیلنجز سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

---

[69] ایضاً، کتاب پنجم، باب اوّل، حصہ دوم، مضمون اوّل، صفحہ 744، پیرا گراف e22 ۔

۴۔ دی تھیوری آف مارل سنٹیمنٹس

The Theory of Moral Sentiments سن 1759 میں شائع ہوئی۔ اُس وقت آدم اسمتھ کی عمر پینتیس برس تھی۔ یہ کتاب دراصل یونیورسٹی آف گلاسگو میں اخلاقیات (Ethics) پر دیے گئے اس کے لیکچرز سے اخذ کی گئی تھی۔

یہ کتاب پڑھنے میں آسان نہیں۔ اسمتھ بیانِ خطابت (Rhetoric) اور ادبی اسلوب پر بھی لیکچر دیتا تھا، اسی لیے اس کی زبان آج کے بہت سے فلسفیوں کی مختصر اور ''سائنسی'' نثر کے مقابلے میں زیادہ رنگین، تفصیلی اور تصویری ہے۔ اسی لیے اسمتھ کے دوست ایڈمنڈ برک نے اسے ''تحریر سے زیادہ مصوری'' قرار دیا تھا۔ یہ کتاب آہستہ پڑھنے اور توجہ سے سمجھنے کی چیز ہے۔

کتاب کے بنیادی موضوعات

اس کے باوجود، The Theory of Moral Sentiments اپنے وقت کی ایک بڑی علمی پیش رفت تھی۔ اس کتاب کا بنیادی دعویٰ یہ ہے کہ ہمارے اخلاقی تصورات اور اخلاقی فیصلے ہماری سماجی فطرت سے جنم لیتے ہیں۔ اسمتھ کے نزدیک اخلاقیات کی رہنمائی صرف خشک عقل سے نہیں ہوتی؛ ہماری سماجی نفسیات — یعنی ہم دوسروں کو کیسے دیکھتے ہیں اور دوسروں کے سامنے خود کو کیسے سنبھالتے ہیں — زیادہ مضبوط بنیاد فراہم کرتی ہے۔

یہ کتاب احتیاط اور انصاف جیسے اُن اصولوں کی نشان دہی کرتی ہے جن کے بغیر کوئی معاشرہ چل نہیں سکتا۔ ساتھ ہی یہ اُن اضافی بھلائی کے کاموں کی بھی وضاحت کرتی ہے جو کسی معاشرے کو صرف ''چلنے'' نہیں دیتے بلکہ اسے پنپنے اور آگے بڑھنے کے قابل بناتے ہیں۔

خود غرضی اور ہمدلی

بطورِ فرد ہم میں اپنی ذات کی بہتری چاہنے کا ایک فطری رجحان ہوتا ہے۔ اسمتھ اسے محض ''لالچ'' نہیں کہتا؛ یہ ایک طرح کی احتیاط ہے — اپنے لیے مناسب فکر۔ لیکن بطورِ سماجی مخلوق ہمیں دوسروں کے لیے بھی ایک فطری احساس دیا گیا ہے۔ اسمتھ اسے ''ہمدردی'' کہتا ہے — اور آج کی زبان

میں یہ ''ہمدلی'' یا empathy کے قریب ہے۔ جب ہم کسی کو غمگیں یا خوش دیکھتے ہیں تو ہم اس کے احساسات میں شریک ہوتے ہیں، اگرچہ عموماً اتنی شدت سے نہیں جتنا وہ خود محسوس کر رہا ہوتا ہے۔

اور چونکہ دوسرے لوگ بھی ہماری ہمدلی چاہتے ہیں، اس لیے اگر ان کے جذبات بہت زیادہ شدید ہوں تو وہ اکثر خود ہی انہیں کچھ قابو میں لانے کی کوشش کرتے ہیں—تاکہ ان کی کیفیت ہماری نسبتاً کم شدت والی کیفیت کے قریب آسکے۔ یوں بچپن سے جوانی تک ہم یہ سیکھتے جاتے ہیں کہ لوگوں کے نزدیک کون سا رویہ قابلِ قبول ہے اور کون سا نہیں۔ اس طرح اخلاقیات ہماری سماجی زندگی سے ہی بنتی چلی جاتی ہیں۔

انصاف اور احسان

اسی طرح **انصاف** بھی ہماری سماجی فطرت سے جڑتا ہے۔ ہم چاہے اپنے مفاد کی طرف مائل ہوں، لیکن ہمیں یہ بھی طے کرنا ہوتا ہے کہ دوسروں کو نقصان پہنچائے بغیر کیسے جینا ہے۔ یہی معاشرے کے قائم رہنے کی کم سے کم شرط ہے۔ اگر لوگ اس حد سے آگے بڑھ کر دوسروں کے لیے بھلائی کریں—یعنی **احسان** کریں—تو ہم اسے پسند کرتے ہیں اور سراہتے ہیں، مگر اس کا مطالبہ اسی طرح نہیں کر سکتے جس طرح انصاف کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔

اخلاقی کمال

اسمتھ کے نزدیک احتیاط، انصاف اور احسان—تینوں اہم ہیں۔ مگر اصل معیار یہ ہے کہ ایک غیر جانبدار شخص—چاہے حقیقی ہو یا صرف تصور میں—ہمارے جذبات اور اعمال کو دیکھ کر یہ کہہ سکے کہ ''یہ مناسب ہے''۔ اسمتھ اسے ''غیر جانب دار ناظر'' کہتا ہے۔

اس مقام تک پہنچنے کے لیے ضبطِ نفس ضروری ہے۔ اسمتھ کی نظر میں بلند کردار اور اخلاقی کمال کا مرکز یہی ضبطِ نفس ہے۔

ہمدلی، اخلاقیات کی بنیاد

اسمتھ کے زمانے کے کئی فلسفی یہ تلاش کر رہے تھے کہ ''درست'' اور ''غلط'' کو محض عقل کے فارمولوں سے ثابت کیا جائے۔ لیکن اسمتھ کے نزدیک اخلاقیات اتنی حسابی نہیں ہوتیں۔ یہ ایک فطری چیز ہے، جو ہمارے اندر بطورِ سماجی انسان پیوست ہے۔ ہم تخیل میں خود کو دوسرے کی جگہ رکھ کر دیکھتے ہیں۔[70] اگر ہم کسی کو مار کھانے کے قریب دیکھیں تو ہم لاشعوری طور پر سکڑ جاتے ہیں۔ اگر ہم کسی کو ڈھیلی رسی پر چلتے دیکھیں تو ہمارا جسم بھی بے اختیار ساتھ ہلتا ہے۔ اور جب ہم لوگوں کو خوش یا غمگیں دیکھتے ہیں تو ہم بھی کچھ نہ کچھ خوشی یا غم محسوس کرتے ہیں۔

ہم دوسروں کے اُن جذبات اور اعمال کے ساتھ زیادہ آسانی سے شریک ہوتے ہیں جنہیں ہم ''مناسب'' سمجھتے ہیں۔ درحقیقت دوسروں کے ساتھ ہم آہنگ ہونا ہمیں خوشی دیتا ہے؛[71] اور جب ہم کسی کے احساسات کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہو سکیں تو یہ کیفیت دونوں طرف کے لیے ناگواری پیدا کرتی ہے۔ اسمتھ یہ بھی بتاتا ہے کہ ہم عموماً خود جذبے کے ساتھ اتنی ہمدلی نہیں کرتے جتنی اس صورتِ حال کے ساتھ کرتے ہیں جس نے وہ جذبہ پیدا کیا ہو۔ مثلاً کسی غصے میں بھرے انسان کو دیکھ کر ہم فوراً اس کے غصے میں شریک نہیں ہوتے؛ ہم پہلے یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ معاملہ کیا ہے، اور یہ غصہ کتنی حد تک جائز ہے۔ اور اگر ہمیں لگے کہ کسی نے واقعے پر حد سے زیادہ ردعمل دیا ہے، تو وہ ہماری ہمدلی کھو بیٹھتا ہے۔

عدم ہم آہنگی اور ضبطِ نفس

تماشائی ہونے کی حیثیت سے ہم دوسروں کے جذبات کی شدت پوری طرح محسوس نہیں کر سکتے — مثلاً اس شخص کا گہرا دکھ جس نے عزیز کھویا ہو، یا اس فرد کا شدید غصہ جس کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہو۔ ہماری ہمدلی سچی ہوتی ہے، مگر عموماً کم شدت کی۔ لیکن جیسے ہم دوسروں کے جذبات دیکھتے ہیں، ویسے ہی دوسرے لوگ ہمارے جذبات دیکھتے ہیں۔ جہاں ہمارے اور ان کے احساسات میں فرق آتا ہے،

---

[70] تھیوری آف مورل سینٹیمنٹس، حصہ اوّل، دفعہ اوّل، باب اوّل، صفحہ 9، پیرا گراف 1۔

[71] ایضاً، حصہ اوّل، دفعہ اوّل، باب دوم۔

وہاں بے چینی پیدا ہوتی ہے۔ یہی بے چینی انسان کو اس طرف لے جاتی ہے کہ وہ اپنے جذبات کی شدت کچھ کم کرے، انہیں قابو میں رکھے، اور دوسروں کے اندازِ نظر کے قریب لے آئے۔

ہم زندگی میں آہستہ آہستہ یہی ضبطِ نفس سیکھتے ہیں: اپنے جذبات کو اتنا متوازن کرنا کہ ایک ''عام'' غیر جانب دار شخص ہمارے رویّے کو مناسب سمجھے۔ یہی وہ اندرونی معیار ہے جسے اسمتھ ''غیر جانب دار ناظر'' کہتا ہے—جو حقیقی بھی ہو سکتا ہے اور صرف تصور میں بھی، مگر بہر حال ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ تجربے کے ساتھ ہم رفتہ رفتہ اصولوں کا ایک نظام بنا لیتے ہیں—یعنی اخلاقیات—اور یہی نظام معاشرے کو پھلنے پھولنے میں مدد دیتا ہے۔

اور اسی وجہ سے یہ ہے کہ دوسروں کے لیے بہت زیادہ اور اپنے لیے بہت کم محسوس کرنا، اپنی خود غرض خواہشات کو قابو میں رکھنا، اور اپنی خیر خواہی پر مبنی محبتوں کو پروان چڑھانا—یہی انسانی فطرت کے کمال کی تشکیل کرتا ہے؛ اور یہی واحد چیز ہے جو انسانوں کے درمیان جذبات و احساسات کی اُس ہم آہنگی کو جنم دے سکتی ہے جس میں اُن کی پوری شائستگی اور موزونیت پوشیدہ ہے۔[72]

انعام، سزا اور معاشرہ

اسمتھ مختلف جذبات—بھوک، محبت، مہربانی، رنجش[73] وغیرہ—کی ''موزونیت'' پر غور کرنے کے بعد اس سوال کی طرف آتا ہے کہ کون سا عمل تعریف اور انعام کے قابل ہے اور کون سا مذمت اور سزا کے۔ اس کے لیے، اسمتھ کے مطابق، ہمیں نتیجے اور محرک میں فرق کرنا ہوتا ہے۔ اگر کسی مددگار عمل سے کسی کو فائدہ پہنچا ہو تو ہم صرف اس فائدے پر خوش نہیں ہوتے؛ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہ عمل کس نیت سے کیا گیا تھا۔ اگر محرک ہمیں درست لگے تو ہم اسے واقعی قابلِ تعریف سمجھتے ہیں۔

---

[72] ایضاً، حصہ اوّل، دفعہ اوّل، باب پنجم، صفحہ 25، پیرا گراف 5۔

[73] ایضاً، حصہ اوّل، دفعہ دوم۔

اسی طرح، کسی نقصان دہ عمل پر ہم تبھی پوری ناراضی محسوس کرتے ہیں جب ہمیں اس کے پیچھے محرک بھی ناپسندیدہ لگے۔[74] اسمتھ کے نزدیک عام طور پر ہم کسی مددگار عمل کو اسی وقت انعام کے قابل سمجھتے ہیں جب وہ اچھے محرک سے پیدا ہوا ہو؛ اور کسی نقصان دہ عمل کو اسی وقت سزا کے قابل سمجھتے ہیں جب وہ برے محرک سے نکلا ہو۔[75]

سزا اور انعام معاشرتی زندگی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ہم اُن اعمال کو سراہتے اور بڑھاتے ہیں جو معاشرے کے لیے فائدہ مند ہوں، اور اُن اعمال کو روکتے ہیں جو معاشرے کو نقصان پہنچاتے ہوں۔ اسمتھ لکھتا ہے کہ معاشرے کا محض وجود ہی اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ بلاوجہ کی بدنیتی کو مناسب سزا کے ذریعے قابو میں رکھا جائے۔[76]

اسمتھ کے نزدیک یہ عمل فطری ہے۔ ہم ہر بار عقل سے یہ طے نہیں کر سکتے کہ کون سا عمل معاشرے کے لیے کتنا فائدہ مند ہے۔ مگر فطرت—یا اسمتھ کی زبان میں خدا—نے ہمارے اندر کچھ پسند و ناپسند رکھی ہے جو عمومی طور پر معاشرتی نظم کو قائم رکھتی ہے۔ اگر ہم اس کے برعکس چلیں تو معاشرہ بکھر جائے۔

یہی بات اسمتھ کے ''غیر مرئی ہاتھ'' کے تصور کے قریب آتی ہے: یعنی لوگ اپنے اپنے محرکات کے تحت چلتے ہیں، مگر مجموعی نتیجہ اکثر ایک منظم سماجی ترتیب کی شکل اختیار کر لیتا ہے—[77] بغیر اس کے کہ کسی نے اسے شعوری طور پر منصوبہ بنایا ہو۔

---

[74] ایضاً، حصہ دوم، دفعہ اوّل، ابواب سوم اور چہارم۔

[75] ایضاً، حصہ دوم، دفعہ اوّل، باب چہارم۔

[76] ایضاً، حصہ دوم، دفعہ اوّل، باب پنجم، صفحہ 77، پیرا گراف 10۔

[77] ایضاً، حصہ دوم، دفعہ دوم، باب سوم۔

آخر میں اسمتھ دوبارہ محرکات اور نتائج کے سوال پر لوٹتا ہے[78]: بعض اوقات برے ارادے سے کیا گیا عمل نقصان نہیں پہنچاتا، اور بعض اوقات بغیر ارادے کے نقصان ہو جاتا ہے۔ تو پھر سزا کس کو ملنی چاہیے—نیت کو یا نتیجے کو؟

اسمتھ کا جواب سادہ ہے: ہم لوگوں کے دلوں میں نہیں جھانک سکتے۔ اگر ہم صرف نیتوں پر سزا دینے لگیں تو کوئی بھی محفوظ نہیں رہے گا۔ اس لیے ہم عموماً سزا اُن اعمال پر دیتے ہیں جو واقعی نقصان کا سبب بنیں—یا جن کا مقصد ہی نقصان پہنچانا ہو۔

انصاف بطور بنیاد

کسی معاشرے کے قائم رہنے کے لیے لازم ہے کہ کچھ ایسے قواعد موجود ہوں جو افراد کو ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے سے روکیں۔ اسمتھ کے مطابق چوروں اور قاتلوں پر مشتمل ایک معاشرہ بھی چل سکتا ہے—لیکن صرف اسی حد تک کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کو لوٹنے اور قتل کرنے سے باز رہیں۔79 انہی بنیادی قواعد کو ہم انصاف کہتے ہیں۔

اگر کوئی شخص دوسروں کی مدد کرنے کے قابل ہوتے ہوئے بھی مدد نہ کرے، یا کسی نیکی کے بدلے احسان کا حق ادا نہ کرے، تو ہم اسے بے رحم یا ناشکرا کہہ سکتے ہیں۔ مگر ہم لوگوں کو نیکی پر مجبور کرنے کے لیے سزا نہیں دیتے۔ سزا صرف اُن اعمال پر دی جاتی ہے جو واقعی نقصان پہنچائیں، یا جن کا مقصد ہی نقصان پہنچانا ہو۔ ہم لوگوں کو صرف انصاف کے قواعد پر عمل کرنے پر مجبور کرتے ہیں—کیونکہ ان کے بغیر معاشرہ قائم ہی نہیں رہ سکتا۔[80]

انصاف کا مقصد ''بھلائی کو زیادہ سے زیادہ کرنا'' نہیں، بلکہ نقصان کو روکنا ہے۔ مثال کے طور پر ہم کسی کو یہ حق نہیں دیتے کہ وہ کسی دوسرے کی چیز محض اس بنیاد پر چھین لے کہ وہ اس کے لیے

---

[78] ایضاً، حصہ دوم، دفعہ سوم، ابواب اوّل اور دوم۔

[79] ایضاً، حصہ دوم، دفعہ دوم، باب سوم، صفحہ 86، پیرا گراف 3۔

[80] ایضاً، حصہ دوم، دفعہ دوم، باب اوّل۔

زیادہ مفید ہو سکتی ہے۔[81] چونکہ ہر شخص فطری طور پر اپنے مفاد کو دوسروں پر ترجیح دیتا ہے، اگر ایسا حق دے دیا جائے تو ہم سب ایک دوسرے کی مستقل لوٹ مار کا شکار بن جائیں۔

انصاف وہ ڈھال ہے جس کے ذریعے معاشرہ خود کو نقصان سے محفوظ رکھتا ہے۔ اسمتھ کے نزدیک یہ اتنا بنیادی اصول ہے کہ فطرت نے اس کی حفاظت کے لیے ہمیں نہایت مضبوط جبلّی احساسات دیے ہیں۔ ناانصافی کے خلاف ہماری ناپسندیدگی اتنی شدید ہوتی ہے کہ وہ اس کے مرتکب فرد کے اندر شرمندگی اور پشیمانی کو جنم دے سکتی ہے۔

خود احتسابی اور ضمیر

اسمتھ کے مطابق فطرت نے ہمیں سزا سے بھی زیادہ فوری اور اندرونی چیز دی ہے: خود احتسابی۔ ہم صرف دوسروں کے اعمال کے غیر جانب دار ناظر نہیں ہوتے، اپنے اعمال کے بھی ہوتے ہیں۔ یوں انسان اپنے اندر دو کرداروں میں بٹ جاتا ہے: ایک عامل، اور دوسرا منصف۔[82] اور یہ اندرونی منصف محض لوگوں کی تعریف پر مطمئن نہیں ہوتا۔ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہم واقعی تعریف کے قابل ہوں۔ ہمیں تبھی اطمینان ملتا ہے جب ہمیں لگے کہ دوسروں کی تعریف ہمارے اعمال کے مطابق اور جائز ہے۔[83]

اسمتھ کے نزدیک ضمیر کی یہی چنگاری معاشرتی زندگی میں بہت طاقتور کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ہمیں اس بات سے روکتی ہے کہ ہم صرف اپنی ہی تقدیر میں کھو جائیں اور دوسروں کی تقدیر سے بالکل لاتعلق ہو جائیں۔ ایک مشہور مثال میں اسمتھ کہتا ہے: اگر چین میں ایک عظیم زلزلہ آ جائے اور پورا ملک تباہ ہو جائے تو یورپ میں رہنے والا کوئی شخص کچھ نہ کچھ رنج ضرور محسوس کرے گا — لیکن یہ رنج اس تکلیف کے مقابلے میں بہت چھوٹا ہو گا جو کسی ذاتی مصیبت سے اسے پہنچتی ہے۔ مثلاً: اگر وہ کل اپنی چھوٹی

---

[81] ایضاً، حصہ دوم، دفعہ دوم، باب دوم۔

[82] ایضاً، حصہ سوم، باب اوّل۔

[83] ایضاً، حصہ سوم، باب دوم۔

انگلی کھو بیٹھے تو آج رات اسے نیند نہ آئے؛ لیکن اگر اس نے کبھی انہیں اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہو، تو وہ اپنے کروڑوں بھائیوں کی ہلاکت اور اس عظیم انسانی مجموعے کی تباہی پر نہایت بے فکری کے ساتھ سو جائے گا۔[84]

لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمام انسان یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔ ضمیر فطرت کا وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے وہ ہمیں یہ یاد دہانی کراتی ہے۔ کیا ہم اپنی ایک چھوٹی سی انگلی بچانے کے لیے کروڑوں انسانوں کی جانیں قربان کر دیں گے؟ یقیناً نہیں—— ضمیر ہمیں اس کی اجازت نہیں دیتا۔ ضمیر ہمیں درست زاویۂ نظر دیتا ہے: یہ ہماری خود غرضی پر لگام ڈالتا ہے، اور ہمیں اس بات سے روکتا ہے کہ ہم محض ذاتی فائدے کے لیے دوسروں کو نقصان پہنچائیں۔ اسی سے ہمیں اپنی خواہشات پر قابو رکھنے کی طاقت ملتی ہے۔[85]

اخلاقی قواعد

یہ پورا عمل ہمارے اندر موجود اس فطری رجحان سے مضبوط ہوتا ہے کہ ہم قواعد بناتے ہیں اور پھر انہی کی پابندی کرتے ہیں۔ اسمتھ کے مطابق جب ہم کسی کو برا برتاؤ کرتے دیکھتے ہیں تو ہمارا اندرونی منصف ہمیں عزم دلاتا ہے کہ ہم خود ایسا نہیں کریں گے۔ اور جب ہم کسی کو اچھا برتاؤ کرتے دیکھتے ہیں تو ہم اس طرزِ عمل کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یوں بار بار فیصلے کرتے کرتے ہم رفتہ رفتہ طرزِ عمل کے قواعد بنا لیتے ہیں۔[86] اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ہر نئی صورتِ حال میں ہمیں از سرِ نو پوری اخلاقی بحث نہیں کرنی پڑتی۔

ہمارے پاس کچھ معیار موجود ہوتے ہیں جو ہمیں سیدھی سمت دکھاتے ہیں۔ یہی معیار ''فرض'' کا احساس پیدا کرتے ہیں—— اور ہمیں انصاف، دیانت اور شائستگی پر قائم رکھتے ہیں، چاہے اس وقت ہمارے جذبات کچھ بھی ہوں۔ یہ ثابت قدمی سماجی نظم کے لیے فائدہ مند ہے۔ اپنے ضمیر کی پیروی

---

[84] ایضاً، حصہ سوم، باب سوم، صفحات 136–137، پیرا گراف 4۔

[85] ایضاً، حصہ سوم، باب سوم۔

[86] ایضاً، حصہ سوم، باب چہارم، صفحہ 159، پیرا گراف 7–8۔

کرتے ہوئے ہم بالآخر — یقینی طور پر مگر غیر ارادی طور پر — انسانی خوشحالی کو بڑھاتے ہیں۔[87] انسانی قوانین بھی سزاؤں اور انعامات کے ذریعے یہی مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں، مگر وہ ضمیر اور فطرت کے وضع کردہ قواعد جتنے فوری، مستقل اور مؤثر نہیں ہو سکتے۔

اسمتھ یہ بھی مانتا ہے کہ اخلاقی قواعد زمانے اور مقام کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ جس طرح مختلف ثقافتوں میں حسن کے معیار مانوسیت کے مطابق بدل جاتے ہیں، اسی طرح طرزِ عمل کے ''حسن'' کے بارے میں خیالات بھی مختلف ہو سکتے ہیں۔[88] مثال کے طور پر شادی کے طریقے مختلف ہوتے ہیں، جنسی رویّوں کے ضابطے مختلف ہو سکتے ہیں، اور مہمان نوازی یا شائستگی کے معیار بھی بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن اسمتھ کے نزدیک یہ اختلافات ثانوی ہیں۔ اگر فطرت کے بنیادی اصول — خصوصاً انصاف — کمزور پڑ جائیں تو معاشرہ قائم ہی نہیں رہ سکتا۔

دولت کے بارے میں رویّے

ایک اور چیز جو ہمارے اخلاقی فیصلوں کو متاثر کرتی ہے — اور ہمیشہ اچھے انداز میں نہیں — وہ دولت ہے۔ اس موضوع پر اسمتھ کی گفتگو اُن لوگوں کے لیے خاصی حیران کن ہو گی جو اسے محض حرص و آز کا وکیل سمجھتے ہیں۔ اسمتھ کہتا ہے کہ دولت کے ذریعے ملنے والی آسائشیں حقیقت میں اتنی غیر معمولی نہیں ہوتیں۔ نفیس کوٹ موسم سے کھردرے کوٹ سے بہت زیادہ بہتر حفاظت نہیں کرتا۔ امیر آدمی کسی اور سے زیادہ کھا نہیں سکتا۔ اور ایک مزدور جو سادہ جھونپڑی میں رہتا ہے، ممکن ہے وہ کسی عظیم محل میں رہنے والے بادشاہ سے زیادہ سکون کی نیند سوئے۔ دولت ہمیں خوف، غم یا موت سے نجات نہیں دلا سکتی۔

اس کے باوجود ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ پیسہ خوشی خرید سکتا ہے، اور یہ کہ امیر اور مشہور لوگ لازماً زیادہ خوش ہوں گے۔ ہم ان کی خوش نصیبی میں ایک عجیب سی مسرت محسوس کرتے ہیں، اور ان کی

---

[87] ایضاً، حصہ سوم، باب پنجم۔

[88] ایضاً، حصہ پنجم، باب اوّل اور باب دوم، صفحہ 200، پیرا گراف 1۔

زندگیاں ہماری دلچسپی کا مرکز بن جاتی ہیں۔ ظاہر ہے لوگوں کی توجہ کا مرکز بننا خود ایک خوشگوار احساس ہے۔ چنانچہ امیروں کے لیے دولت کا اصل فائدہ وہ چھوٹی موٹی آسائشیں نہیں ہوتیں جو وہ خرید سکتی ہے، بلکہ وہ توجہ اور تحسین ہوتی ہے جو یہ دولت پیدا کرتی ہے۔

لیکن اس میں خود فریبی بھی شامل ہے۔ عوامی دلچسپی اکثر انسان کی حقیقی اہلیت کے بجائے اس کے پاس موجود دولت یا مرتبے سے جڑ جاتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جنہیں اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا، اکثر امیروں کی ''بدکاری اور حماقت'' کو نظر انداز کر دیتے ہیں، اور انہیں ان کی اصل حیثیت سے بڑھ کر خوشامد کا نشانہ بناتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں دولت اور مرتبہ رکھنے والے افراد یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ واقعی اس سب کی تعریف کے مستحق ہیں—یہاں تک کہ اُن حالات میں بھی جب حقیقت میں وہ اس کے حقدار نہیں ہوتے۔

خود بہتری

اور پھر بھی دولت کے حصول کی جستجو کچھ اور نتائج بھی لے کر آتی ہے۔[89] جب لوگ امیروں کے بڑے گھروں یا شاندار سواریوں کو دیکھتے ہیں تو وہ اُس زندگی سے حسد کرنے لگتے ہیں جسے وہ آرام اور آسودگی سے بھرپور سمجھتے ہیں۔ اسمتھ کے مطابق عجیب بات یہ ہے کہ وہی لوگ اسی زندگی کو پانے کے لیے عمر بھر کی مشقت اور بے آرامی قبول کر لیتے ہیں۔

یوں دولت کی وہ ''لذتیں''، جنہیں ہم حقیقت سے بڑھا کر دیکھتے ہیں—اور جو بڑی حد تک ایک فریب ہوتی ہیں—ہمیں مادی دنیا میں غیر معمولی جدوجہد پر آمادہ کرتی ہیں۔ اور یہ جدوجہد صرف کمائی تک محدود نہیں رہتی؛ یہ ہماری فکری اور فنی زندگیوں میں بھی پیش رفت کا سبب بنتی ہے۔ اسمتھ کے الفاظ میں یہی وہ فریب ہے جو بنی نوع انسان کی محنت کو بیدار رکھتا ہے؛ جس نے انسان کو زمین کاشت کرنے، گھر بنانے، شہر اور ریاستیں قائم کرنے، اور اُن علوم و فنون کو ترقی دینے پر آمادہ کیا جنہوں نے انسانی

---

[89] ایضاً، حصہ چہارم، باب اوّل۔

زندگی کو وقار اور حسن دیا۔ اسی نے کرۂ ارض کی صورت بدل دی: جنگلات کو آباد میدانوں میں بدل دیا، اور سمندر کو رزق کے نئے وسیلے اور اقوام کے درمیان رابطے کی عظیم شاہراہ بنا دیا۔[90]

لیکن امیر لوگ غریبوں کے مقابلے میں بہت زیادہ خرچ نہیں کرتے؛ وہ بس ایسی چیزیں چنتے ہیں جو زیادہ قیمتی، زیادہ خوش نما اور زیادہ نفیس ہوتی ہیں۔ اور چونکہ وہ اُن لوگوں کو روزگار دیتے ہیں جو ان کی خدمت کرتے ہیں، یا اُن صنعتوں کو چلاتے ہیں جن کی محنت ان نفیس اشیا کی تیاری میں لگتی ہے، اس لیے ان کے پاس جمع ہونے والے وسائل پورے معاشرے میں پھیلنے لگتے ہیں۔ اسمتھ کے بقول، وہ گویا ایک ''غیر مرئی ہاتھ'' کے زیرِ اثر زندگی کی ضروریات کی ایسی تقسیم کر دیتے ہیں جو تقریباً ویسی ہی ہوتی ہے جیسے زمین کو ابتدا ہی میں تمام باشندوں میں برابر بانٹ دیا گیا ہو۔[91]

اعلیٰ کردار پر گفتگو

اخلاقیات کے سرچشموں اور انسانی فطرت کی وضاحت کے بعد، اسمتھ The Theory of Moral Sentiments کے اختتام پر یہ بات واضح کرتا ہے کہ واقعی بلند کردار انسان کیسا ہوتا ہے۔ اس کے مطابق ایسے شخص میں احتیاط، انصاف اور احسان جیسی صفات ہوتی ہیں۔ ایک چوتھی صفت ــــ ضبطِ نفس ــــ بھی ضروری ہے، اگرچہ یہ ہر حال میں لازماً خیر کا باعث نہیں بنتی۔ احتیاط فرد کی اپنی نگہداشت سے متعلق ہے۔ یہ خواہشات کو حد سے بڑھنے نہیں دیتی اور آدمی کو متوازن رکھتی ہے۔ اسی اعتبار سے یہ معاشرے کے لیے بھی مفید ہے۔ یہ صفت قابلِ احترام ضرور ہے، مگر لازماً دلکش نہیں۔[92]

انصاف اس بات سے تعلق رکھتا ہے کہ ہم دوسروں کو کتنا نقصان پہنچاتے ہیں ــــ اور اس نقصان کو روکتا یا محدود کرتا ہے۔ یہ سماجی زندگی کے قائم رہنے کے لیے ناگزیر ہے۔

---

[90] ایضاً، حصہ چہارم، باب اوّل، صفحات 183–184، پیراگراف 10۔

[91] ایضاً، حصہ چہارم، باب اوّل، صفحات 184–185، پیراگراف 10۔

[92] ایضاً، حصہ ششم، دفعہ اوّل، باب اوّل۔

احسان سماجی زندگی کو بہتر بناتا ہے، کیونکہ یہ ہمیں دوسروں کی خوشی بڑھانے پر آمادہ کرتا ہے۔ اسے کسی سے بزورِ طاقت طلب نہیں کیا جاسکتا، مگر اسے ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

اور ضبطِ نفس ہماری خواہشات اور جذبات کو قابو میں رکھتا ہے۔ خوف عارضی طور پر غصہ دبا سکتا ہے، مگر جونہی ہم خود کو محفوظ سمجھتے ہیں وہی غصہ دوبارہ ابھر آتا ہے۔ اس کے برعکس، اگر ہم ضبطِ نفس کے ذریعے غصے کو اس حد تک متوازن کر لیں کہ وہ دوسروں کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے، تو غصہ حقیقتاً گم ہو جاتا ہے۔[93]

فطری طور پر انسان سب سے زیادہ فکر اپنی ذات کی کرتا ہے، پھر اپنے خاندان کی، پھر دوستوں اور آہستہ آہستہ زیادہ دور کے لوگوں کی۔[94] اسی طرح ہم اپنے ملک کو دوسرے ممالک کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔[95] لیکن اسمتھ کے نزدیک حقیقی احسان کسی حد یا سرحد کو نہیں مانتا۔ چونکہ مجموعی انسانیت کی حیثیت ایک فرد سے زیادہ ہے، اس لیے ایک واقعی بلند کردار انسان کو اس بات کے لیے تیار ہونا چاہیے کہ وہ "کائنات کے وسیع تر مفاد" کے لیے ذاتی قربانیاں بھی دے۔[96]

ایک اچھے معاشرے کی تشکیل

فطرت افراد کو ایثار پر آمادہ بھی کرتی ہے، اور ہم اُس ضبطِ نفس کی تعریف بھی کرتے ہیں جو انہیں ایسے اعمال پر قادر بناتا ہے۔ لیکن لوگ اچھی وجوہات کے ساتھ ساتھ بری وجوہات کی بنیاد پر بھی خود کو قربان کر سکتے ہیں۔ یوں ایک ہیرو کا ضبطِ نفس کسی جنونی کی فولادی ضد میں بھی بدل سکتا ہے۔

نوعِ انسانی سے محبت، اپنی ریاست سے محبت کے برابر نہیں ہوتی۔[97] ریاست سے وابستگی میں دستور، implying نظم و نسق کے لیے احترام بھی شامل ہوتا ہے، اور یہ خواہش بھی کہ ہمارے ہم

---

[93] ایضاً، حصہ ششم، اختتامیہ، صفحہ 263، پیرا گراف 3۔

[94] ایضاً، حصہ ششم، دفعہ اوّل، باب اوّل۔

[95] ایضاً، حصہ ششم، دفعہ اوّل، باب دوم۔

[96] ایضاً، حصہ ششم، دفعہ سوم، باب سوم، صفحہ 235، پیرا گراف 3۔

[97] ایضاً، حصہ ششم، دفعہ دوم، باب دوم، صفحہ 229، پیرا گراف 4۔

وطن خوش حال ہوں۔ عام حالات میں یہ چیزیں ساتھ چلتی ہیں، مگر سیاسی انتشار کے زمانے میں یہ ٹکرا بھی سکتی ہیں۔

ایسے حالات میں سیاست دان اکثر بڑے بڑے اصلاحاتی منصوبے لے کر آتے ہیں۔ اسمتھ کے مطابق وہ موجودہ اداروں کو گرانے کی تجویز دیتے ہیں، حالانکہ انہی اداروں نے بہت سے فوائد بھی دیے ہوتے ہیں۔ پھر وہ اس کے بدلے ایک ''عقلی'' متبادل پیش کرتے ہیں—مگر یہ انسانی فطرت کے خلاف ہوتا ہے۔

اسمتھ اسے ''نظام کا آدمی'' کہتا ہے: ایسا شخص جو اپنے خیال میں خود کو بہت دانا سمجھتا ہے، اور اپنی تجویز کردہ حکومتی اسکیم کی مبینہ خوب صورتی پر اس قدر فریفتہ ہو جاتا ہے کہ وہ اس میں معمولی سی تبدیلی بھی برداشت نہیں کرتا۔ اسے یوں لگتا ہے جیسے وہ ایک عظیم معاشرے کے افراد کو اتنی ہی آسانی سے ترتیب دے سکتا ہے جتنی آسانی سے ہاتھ شطرنج کے تختے پر مہرے سجا دیتا ہے۔ وہ یہ بھول جاتا ہے کہ انسانی معاشرے کی اس عظیم شطرنج میں ہر مہرہ اپنی حرکت کا ایک الگ اصول رکھتا ہے—جو اُس اصول سے بالکل مختلف ہوتا ہے جسے قانون ساز اس پر مسلط کرنا چاہتا ہے۔[98]

اسی لیے اسمتھ کے نزدیک آزادی اور فطرت، ایک ہم آہنگ اور مؤثر معاشرہ بنانے کے لیے، جنونیوں اور خیالی منصوبہ سازوں کی حد سے بڑھی ہوئی عقل کے مقابلے میں کہیں زیادہ قابلِ اعتماد رہنما ہیں۔

---

[98] ایضاً، حصہ ششم، دفعہ دوم، باب دوم، صفحات 233–234، پیرا گراف 17۔

۵۔اسمتھ کے لیکچرز اور دیگر تحریریں

اسمتھ نے وصیت کی تھی کہ اس کی زیادہ تر غیر شائع شدہ تحریریں اس کی وفات کے بعد جلادی جائیں۔اُس زمانے میں یہ خواہش غیر معمولی نہیں سمجھی جاتی تھی، کیونکہ بہت سے مصنفین چاہتے تھے کہ ان کا فیصلہ ان کے مکمل اور حتمی کام کی بنیاد پر ہو، نہ کہ ابتدائی نوٹس یا ادھورے مسودات پر۔ چنانچہ The Theory of Moral Sentiments اور The Wealth of Nations کے علاوہ اس کی تحریروں کا بہت کم حصہ محفوظ رہ سکا۔

پھر بھی جو کچھ بچ گیا، وہ اسمتھ کے علم اور دلچسپیوں کی حیرت انگیز وسعت دکھاتا ہے۔ سیموئیل جانسن کی لغت پر تبصرہ، یورپ میں فکری رجحانات اور زبانوں کی ابتدا پر مضامین، فنونِ لطیفہ پر مقالات جن میں مصوری، ڈراما، موسیقی اور رقص شامل ہیں، انگریزی اور اطالوی شاعری پر آرا، قدیم طبیعیات اور فلسفے کی تاریخ پر تحریریں، اور The History of Astronomy پر ستر صفحات پر مشتمل ایک مفصل مقالہ۔

خوش قسمتی سے اس کے طلبہ کے بنائے ہوئے کچھ نوٹس بھی محفوظ ہیں، جو خطابت اور لطیف ادب پر لیکچرز، اور قانونیات پر لیکچرز سے متعلق ہیں۔ یہ اسمتھ کے اپنے لکھے ہوئے الفاظ تو نہیں، لیکن گلاسگو میں اس کی فکری تشکیل اور ارتقا کے بارے میں نہایت قیمتی بصیرت دیتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں سے کئی پیراگراف بعد میں The Wealth of Nations میں بھی دوبارہ سامنے آتے ہیں۔

مرکزی وحدت کا موضوع

بظاہر اسمتھ کے موضوعات بے حد متنوع ہیں، مگر یہ سب مل کر اس کے فکری انداز کے بارے میں ایک بنیادی بات واضح کرتے ہیں۔ اسمتھ صرف ماہرِ معاشیات، اخلاقیات کا مفکر، مورخ یا قواعد دان نہیں تھا۔ اصل میں وہ انسانی معاشرت اور انسانی ذہن کے باہمی ربط کا مطالعہ کرتا تھا، یعنی ایک طرح سے سماجی نفسیات دان تھا۔

اس کی دلچسپی اس بات میں تھی کہ انسانی ذہن دنیا اور دوسرے انسانوں سے کیسے تعامل کرتا ہے، اور یہی تعامل کیسے بڑے اجتماعی نتائج پیدا کرتا ہے۔ اس کے نزدیک ''علم''، حقیقتِ مطلق کی تلاش سے کم، اور اس بات کی سمجھ سے زیادہ متعلق تھا کہ انسانی ذہن حقیقت کو کیسے ترتیب دیتا ہے، اسے کیسے سمجھتا ہے، اور اس کے مطابق کیسے عمل کرتا ہے۔

زبان، اخلاقیات اور معیشت اسمتھ کے نزدیک ایسے مفید سماجی ڈھانچے ہیں جو کسی مرکزی منصوبہ بندی کے بغیر، انسانی اذہان کے باہمی تعامل سے ابھر آتے ہیں۔ اسی طرح قانون اور انصاف اس بات سے متعلق ہیں کہ انسان پُرامن بقائے باہمی کو کیسے ممکن بناتے ہیں۔

یہ توضیحات اپنی فطرت میں وہ ہیں جنہیں آج ہم ارتقائی نوعیت کی توضیحات کہیں گے۔ فطرت نے ہمیں کچھ بنیادی رجحانات دیے ہیں جو مل کر ایسے ادارے تشکیل دیتے ہیں جو عمومی بھلائی کے لیے کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ ہم شاید پوری طرح نہ سمجھ سکیں کہ ہماری سودے بازی، باہمی گفتگو، یا ایک دوسرے کے ساتھ نباہ کرنے کی کوشش کس طرح ایک بڑے اور مفید معاشی، لسانی یا قانونی نظام کو جنم دیتی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ایسا کرتی ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا، اگر یہ رویّے مجموعی طور پر تخریبی ہوتے، تو معاشرہ قائم ہی نہ رہ پاتا۔

اسمتھ دراصل یہی سمجھنا چاہتا ہے کہ انفرادی اعمال بڑے اجتماعی نظام سے کیسے جڑتے ہیں، اور اسے کیسے تشکیل دیتے ہیں۔

اسمتھ اور فلسفۂ سائنس

اسی تناظر میں The History of Astronomy کا مقصد محض ستاروں کے مشاہدے کی تاریخ بیان کرنا نہیں۔ اس کا دائرہ کہیں وسیع ہے، جیسا کہ اس کا مکمل عنوان واضح کرتا ہے : The Principles Which Lead and Direct Philosophical Enquiries; Illustrated by the History of Astronomy۔ یہ کتاب بنیادی طور پر انسانی ذہن کے بارے میں ہے، اور اس بات کے بارے میں کہ ہم دنیا کو کیسے درجہ بند کرتے ہیں، کیسے اس کی توضیح کرتے ہیں، اور کیسے فہم قائم کرتے ہیں۔

یہ پہلے اس سوال سے آغاز کرتی ہے کہ ہمیں نظریہ سازی کی طرف کیا چیز کھینچتی ہے۔ پھر دکھاتی ہے کہ نظریات کیسے پیش کیے جاتے ہیں، کیسے آزمائے جاتے ہیں، اور بالآخر کیسے ان کی جگہ نئے نظریات لے لیتے ہیں۔ اس کے بعد یہ بھی واضح کرتی ہے کہ ''اچھا'' نظریہ کن اوصاف کا حامل ہوتا ہے، اور اس ضمن میں نیوٹن کے کام کو مثال بناتی ہے۔

یہ بحث حیرت انگیز طور پر جدید محسوس ہوتی ہے، کیونکہ اس میں سائنس کو حقیقتِ مطلق تک پہنچنے سے زیادہ ایک ''نمونہ سازی'' کے عمل کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ یعنی سائنس دنیا سے کم، اور انسانی نفسیات اور تعبیر سے زیادہ متعلق ہے۔

نامعلوم کی بے چینی

اسمتھ توجہ دلاتا ہے کہ ہم مانوس چیزوں کو معمول سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ لیکن جب کوئی نئی چیز سامنے آتی ہے تو وہ ہمیں چونکا دیتی ہے۔[99] یہ ہمیں تجسس اور حیرت میں مبتلا کرتی ہے کہ یہ نئی شے ہماری جانی پہچانی دنیا میں کہاں فٹ بیٹھتی ہے۔[100] یہ احساس کہ کوئی چیز ہماری موجودہ سمجھ میں نہیں آ رہی، ایک بے چین کرنے والی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ مگر ہماری عقل اور تخیل، اور تجرید اور درجہ بندی کی صلاحیتیں، ہمیں اس قابل بناتی ہیں کہ ہم اس نئے مظہر کو کسی نہ کسی طرح اپنے فہم کے دائرے میں لے آئیں اور اسے ایک وسیع تر تناظر میں سمجھ سکیں۔

مثلاً جب ہم دیکھتے ہیں کہ لوہے کا ایک ٹکڑا مقناطیس کی طرف کھنچ جاتا ہے تو ہمیں حیرت ہوتی ہے۔ پھر ہمارا تخیل یہ امکان پیش کرتا ہے کہ شاید پتھر کے گرد کوئی قوت موجود ہے جو یہ حرکت پیدا کرتی ہے۔ یہ ایک سادہ اور ابتدائی نظریہ ہے، مگر اسمتھ کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ نظریات اسی طرح بنتے ہیں، پھر ان کی جانچ ہوتی ہے، اور آخر کار انہیں زیادہ بہتر اور مربوط صورتوں میں ڈھالا جاتا ہے۔

---

[99] دی ہسٹری آف آسٹرونومی، دفعہ اوّل۔

[100] ایضاً، دفعہ دوم۔

قیاسات اور تردیدات

اسمتھ تاریخِ فلکیات کو بطور مثال سامنے رکھ کر یہی بات واضح کرتا ہے۔[101] قدیم فلکیات دانوں کے لیے حیرت کی چیز سورج، چاند اور ستاروں کی حرکت تھی۔ ایک ابتدائی تجویز یہ تھی کہ آسمان ایک گنبد نما چھت ہے جس کے ساتھ یہ اجرام جڑے ہیں اور وہ روزانہ مشرق سے مغرب کی سمت گھومتی ہے۔ مگر یہ توضیح سیّاروں کی بے قاعدہ حرکت کو سمجھا نہیں پاتی تھی۔

پھر ایک زیادہ پیچیدہ نظریہ سامنے آیا: کئی کرّے ہیں۔ ایک کرّہ باقاعدگی سے مشرق سے مغرب کی طرف گھومتا ہے، اور دوسرے کرّے جن پر سیّارے "سوار" ہیں، نسبتاً بے قاعدہ انداز میں حرکت کرتے ہیں۔ مگر خود یہ بے قاعدگی بھی وضاحت مانگتی تھی۔ نتیجتاً ایک کے اندر ایک گھومنے والے مزید اور مزید کرّوں کا تصور قائم کیا گیا، یہاں تک کہ تعداد بہتر تک جا پہنچی۔ مسئلہ یہ تھا کہ اب یہ نظام خود اتنا ہی الجھا ہوا اور بھاری ہو چکا تھا جتنے وہ مظاہر جنہیں ہموار اور مربوط بنانے کے لیے اسے بنایا گیا تھا۔[102]

بعد کے فلکیات دانوں نے سادہ اور بہتر توضیحات تلاش کیں۔ کوپرنیکس نے ایسا نظام پیش کیا جس میں زمین کے بجائے سورج کو مرکز مانا گیا۔ اس تعبیر میں سیّاروں کی بظاہر بے قاعدہ حرکات سمجھنا آسان ہو گئیں، کیونکہ اب زمین کو بھی حرکت میں تصور کیا جاتا تھا۔ اگرچہ بہت سے لوگ اس خیال سے چونک گئے کہ زمین مرکز نہیں، مگر فلکیات دانوں نے اسے کارآمد پایا، کم از کم اس وقت تک جب تک مزید دقیق مشاہدات نے اس کی خامیاں نمایاں نہ کر دیں۔

اس کے بعد نیوٹن نے نہ صرف یہ سمجھایا کہ سیّارے کیسے حرکت کرتے ہیں، بلکہ یہ بھی بتایا کہ وہ اسی انداز میں کیوں حرکت کرتے ہیں جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں۔ اس کے مطابق وجہ کششِ ثقل تھی۔ چند سادہ قوانین بیضوی مداروں کی توضیح کر دیتے تھے، اور دیگر مظاہر بھی سمجھ میں آ گئے، مثلاً مدار ستارے،

---

[101] ایضاً، دفعہ چہارم۔

[102] ایضاً، دفعہ چہارم، 8، صفحہ 59۔

جنہیں کوپر نیکی ماڈل پوری طرح سمو نہیں پاتا تھا۔ یہ نظریہ سادہ، متوازن اور اپنے اندر ایک خاص حسن رکھنے والا محسوس ہوتا تھا، اور مشاہدہ شدہ حقائق کے ساتھ بھی اچھی طرح ہم آہنگ تھا۔

سائنس اور انسانی فہم

یوں اسمتھ کے نزدیک سائنسی طریقۂ کار، کائنات کی ایسی توضیح تلاش کرنے کا عمل ہے جو انسانی ذہن پر آسانی سے بیٹھ جائے۔ ہم پیچیدگی کو چند سادہ اصولوں میں سمیٹنا چاہتے ہیں جنہیں واقعی سمجھ سکیں۔ نمونے پیش کیے جاتے ہیں، آزمائے جاتے ہیں، ناکافی ثابت ہوتے ہیں، ان میں ترمیم ہوتی ہے، اور جب وہ حد سے زیادہ بوجھل ہو جائیں یا مشاہدے سے بہت ٹکرا جائیں، تو انہیں چھوڑ کر بہتر اور زیادہ سادہ توضیحات اپنا لی جاتی ہیں۔

یہ نقطۂ نظر حیرت انگیز طور پر جدید ہے۔ ہم اُن نظریات میں حسن محسوس کرتے ہیں جو بکھرے ہوئے مشاہدات کے ہجوم کو ''چند مشترک اصولوں'' میں سمو دیتے ہیں، کیونکہ سائنس بڑی حد تک ہمارے اپنے ذہن کی تنظیم ہے۔ اسمتھ کے الفاظ میں ''تمام فلسفیانہ نظام'' بالآخر ''تخیل کی ایجادات'' ہوتے ہیں۔[103]

ابلاغ کی نفسیات

خطابت اور لطیف ادب کے لیکچرز میں بھی اسمتھ کی توجہ کا مرکز انسانی نفسیات ہی ہے، اور اسی کے نتیجے میں ایک اہم سماجی ادارہ، یعنی ابلاغ، کیسے تشکیل پاتا ہے۔ مثلاً وہ مشورہ دیتا ہے کہ اگر سامعین آپ کے ساتھ ہمدردانہ رویہ رکھتے ہوں تو پہلے پورا پیغام یکجا پیش کریں، پھر تفصیل مرحلہ وار دیں۔ لیکن اگر سامعین مخالف یا معاند ہوں تو متنازع نتائج ایک ساتھ ان پر نہ ڈالیں، بلکہ انہیں بتدریج، قدم بہ قدم، ان نتائج تک لے آئیں۔

زبانوں کی ابتدا پر اس کی تحریروں میں بھی یہی زاویۂ نظر ہے۔ چونکہ اس دور کی براہِ راست تحریری شہادتیں موجود نہیں، اس لیے اس کی تاریخ لازماً قیاسی ہے اور مثالیں بھی محدود ہیں۔ مگر اس کا بنیادی دعویٰ ارتقائی ہے۔ زبان انسانی معاشرے کی ترقی کے ساتھ ساتھ پروان چڑھی، اور اسی ترقی کا ایک آلہ بھی بنی۔

---

[103] ایضاً، دفعہ چہارم، 76، صفحہ 105 (نیز ملاحظہ کیجیے: دفعہ دوم، 12، صفحہ 46)۔

ابلاغ اور انسانی فطرت

اسمتھ کے مطابق زبان چونکہ انسانی ذہن کی پیداوار ہے، اس لیے وہ ہماری فطرت کے بارے میں بھی بہت کچھ بتاتی ہے۔ مثال کے طور پر درجہ بندی کی صلاحیت۔ اسمتھ کا خیال ہے کہ ابتدائی انسان شاید ہر چیز کے لیے الگ نام رکھتے ہوں گے۔ یہ طریقہ جلد ہی ناقابل برداشت بوجھ بن جاتا۔ مگر انسانی ذہن کی تجریدی صلاحیت نے اس مشکل کا حل پیدا کیا۔

ہم مختلف چیزوں میں مشترک خصوصیات دیکھ کر پورے ایک طبقے کے لیے ایک ہی لفظ بنا لیتے ہیں، مثلاً ''درخت''۔ پھر ہم اوصاف بھی بیان کرتے ہیں، مثلاً ''سبز درخت''، یا تعلقات، مثلاً ''غار کے اوپر والا درخت"۔[104] یہی طریقے سائنسی سوچ کے لیے بھی لازمی ہیں اور روزمرہ فہم کے لیے بھی نہایت کارآمد۔

موضوع پر تفتیشی طریقِ کار کو لاگو کرنے کا اسمتھ کا عزم اس کی تمام تحقیقات کو ایک وحدت میں جوڑ دیتا ہے، The Wealth of Nations سے لے کر خطابت کے لیکچرز تک۔ پہلی میں وہ پیداوار اور تبادلے کو متحرک کرنے والے محرکات کو بنیادی اجزا میں توڑتا ہے۔ دوسری میں وہ ابلاغ کے پیچھے کارفرما نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے اسلوب و ساخت کا تجزیہ کرتا ہے۔

ابلاغ کی سائنس

اسمتھ کی توجہ کا بڑا حصہ اسلوب پر بھی رہتا ہے۔ وہ زور دیتا ہے کہ اچھا اسلوب مختصر، موزوں اور دقیق ہو۔[105] وہ جذبہ منتقل کرے۔ وہ سلیس، واضح اور سادہ ہو۔ مختصر جملے فہم میں مدد دیتے ہیں۔[106] اور زبان کو سامع کی ہم احساسی اور قبولیت کو بیدار کرنا چاہیے، کیونکہ مؤثر ابلاغ بالآخر نفسیات ہی کا معاملہ

---

[104] لیکچرز آن ریٹورک اینڈ بیلز لیٹرز، لیکچر 3، v.24–v.19، صفحات 10–11؛ اور کنسیڈریشنز کنسرننگ دی فرسٹ فارمیشن آف لینگویجز، 12، صفحہ 209۔

[105] لیکچرز آن ریٹورک اینڈ بیلز لیٹرز، لیکچر 5، v.53، صفحہ 23۔

[106] ایضاً، لیکچر 6۔

ہے۔اسی لیے وہ کہتا ہے کہ مختلف دلائل کے لیے مختلف انداز درکار ہوتے ہیں۔کچھ مباحث میں معروضی بیانیہ ضروری ہے۔

کچھ میں علت و معلول کی وضاحت۔اور بعض میں خطیبانہ اظہار، جس کا مقصد جذبات تک رسائی حاصل کرنا ہوتا ہے۔اس کی مثالیں کلاسیکی ادب سے اس کی غیر معمولی واقفیت بھی دکھاتی ہیں اور علمی گرفت بھی۔اصل نکتہ مگر یہی ہے کہ لوگوں سے مؤثر گفتگو کے لیے پہلے انہیں سمجھنا ضروری ہے۔ انسان فطری طور پر ہم احساسی کی صلاحیت رکھتا ہے،اور یہی صلاحیت زبان کی نشوونما کا سبب بنی،ابتدا کے سادہ اظہار سے لے کر ایک پیچیدہ اور نہایت مفید سماجی ادارے تک۔

حکومت اور عوامی پالیسی پر اسمتھ کے خیالات

قانونیات پر لیکچرز بھی ہمیں طلبہ کے نوٹس میں ملتے ہیں۔[107] ان کے مطابق اسمتھ ''قانونیات'' سے مراد ''قانون اور حکومت کے عمومی اصولوں کا نظریہ'' لیتا ہے،یعنی وہ قواعد جن کے مطابق شہری حکومتوں کو چلنا چاہیے۔[108] یہ لیکچرز بھی سماجی نفسیات ہی کی ایک مشق معلوم ہوتے ہیں۔وہ سمجھنا چاہتا ہے کہ انسانی باہمی تعامل نے ہمیں قوانین اور حکومتی ادارے بنانے پر کس طرح آمادہ کیا۔[109]

ابتدائی حصے کا عنوان ''انصاف'' ہے، مگر موضوعات وسیع ہیں، حکومت کی نوعیت اور ارتقا، آئینی ڈھانچے، داخلی قانون، غلامی، حقوقِ ملکیت، عدالتیں اور فوجداری انصاف۔ دوسرا بڑا حصہ ''پولیس'' یا ''حکمتِ عملی'' کے عنوان سے ہے، جس میں قیمتیں، زرِ مبادلہ، تجارت اور تقسیمِ محنت پر اس کے خیالات شامل ہیں،وہی خیالات جو بعد میں The Wealth of Nations میں مرکزی حیثیت اختیار کرتے ہیں۔

---

[107] دی گلاسگو ایڈیشن میں دو نسخے شامل ہیں: ایک 1762–63 کے سیشن کی رپورٹ،اور دوسرا 1766 کی تاریخ کا۔

[108] لیکچرز آن جیورسپرڈنس،1766 کی تاریخ والی رپورٹ، صفحہ 398۔

[109] ایضاً،1762 63– کی رپورٹ،24 دسمبر 1762 کا لکچر۔

انصاف، حکومت اور قانون

یہاں بھی اسمتھ ارتقائی زاویہ اختیار کرتا ہے۔ جیسے جیسے شکاری معاشروں کی جگہ چرواہوں کا دور آیا، پھر زرعی معاشرے بنے، اور پھر تجارت کا زمانہ آیا، ویسے ویسے ان معاشی انتظامات کو سہارا دینے کے لیے مختلف قانونی اور حکومتی نظام درکار ہوتے گئے۔ ایک صدی بعد مارکس بھی اس نکتے کے قریب پہنچتا ہے کہ پیداواری تعلقات ہی سماجی تعلقات کی تشکیل کرتے ہیں۔[110]

اسمتھ کے مطابق حکومت بنیادی طور پر جائیداد کے تحفظ کے لیے وجود میں آئی، ایک ایسی جائیداد جو چرواہوں اور کاشت کاروں کے ادوار میں اہم بن چکی تھی۔ اور اس انتظام کو انسانی فطرت کے اس رجحان نے بھی تقویت دی کہ ہم اتھارٹی کا احترام کرتے ہیں۔

البتہ نمائندہ حکومت کے بیج، اسمتھ کے نزدیک، منڈی پر مبنی معیشت کے پھیلاؤ سے پڑے۔ اس سے پہلے اختیار اکثر ایک مقتدر شخصیت کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ لیکن تبادلے کی معیشت میں پیدا کرنے والوں کو ایک شخص کے بجائے بے شمار عام لوگوں کی طرف دیکھنا پڑتا ہے، کیونکہ وہی ان کے گاہک ہوتے ہیں۔

محنت اور تبادلہ

یہ لیکچرز یہ بھی دکھاتے ہیں کہ اسمتھ سن 1760 کی دہائی کے وسط میں ہی The Wealth of Nations کے خیالات پر کام کر رہا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ محنت کی تقسیم ہی خوشحالی بڑھاتی ہے۔ یہاں سوئی بنانے کے کارخانے کی مثال بھی ملتی ہے،[111] اور اُونی کوٹ کی مثال بھی، جس میں ہزاروں افراد کا تعاون شامل ہوتا ہے اور پورے معاشرے میں روزگار پھیلتا ہے۔

---

[110] کارل مارکس، دی پاورٹی آف فلاسفی، باب 2، دوسرا مشاہدہ۔

[111] لیکچرز آن جیورسپرڈنس، 1762 63–کی رپورٹ، 29 مارچ 1763 کا لیکچر، صفحات 341–342۔

اور وہی مشہور بات بھی سامنے آتی ہے کہ جب ہم قصائی یا شراب بنانے والے سے گوشت یا بیئر لیتے ہیں تو ہم اس کی خیر خواہی کو نہیں، اس کے مفاد کو مخاطب کرتے ہیں۔[112] ممکن ہے طالب علم اسمتھ کے اصل الفاظ کی ادبی کیفیت پوری طرح محفوظ نہ رکھ سکا ہو، لیکن مفہوم بالکل واضح ہے۔

اسی طرح وہ مرکنٹلسٹ تصور پر سخت تنقید کرتا ہے کہ دولت محض پیسہ ہے، اور اسے بچانے کے لیے درآمدات محدود کرنا لازم ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ ایک امیر شخص فضول خرچی سے اپنا سرمایہ ضائع کر سکتا ہے، اور اس سے پیداوار اور خوشحالی متاثر ہوتی ہے، حالانکہ گردش میں موجود سکوں کی تعداد میں ایک بھی کمی نہیں آتی۔ یعنی دولت اور پیسہ ایک چیز نہیں۔

یہ لیکچرز The Theory of Moral Sentiments کے معاشی پہلو کو بھی آگے بڑھاتے ہیں۔ اسمتھ زور دیتا ہے کہ ہماری مادی ترقی کا محرک صرف ضروریات نہیں، بلکہ خواہشات ہیں۔ اس کے مطابق انسان کی نزاکتِ ذوق ایسی ہے کہ کوئی شے اسے پوری طرح مطمئن نہیں کرتی۔[113] اسی لیے ترقی اس مقام پر رکتی نہیں کہ ہم کھانا، لباس اور رہائش حاصل کر لیں۔ ''بہتری'' کی جستجو ختم نہیں ہوتی، اور اسی جستجو سے صنعت، حرفت، سائنس اور فنون کی ترقی بھی جاری رہتی ہے۔

نااہل حکومت

اگر پیداوار، تبادلہ اور سرمایہ جمع ہونا ترقی کا راستہ ہیں، تو پھر رکاوٹ کیا بنتی ہے؟ اسمتھ کے مطابق اکثر رکاوٹ نااہل حکومت ہوتی ہے۔ سرمایہ جمع ہونے میں وقت لگتا ہے۔ اگر لوگوں کو یہ یقین نہ ہو کہ حکومت انہیں چوری اور لوٹ مار سے بچائے گی، معاہدوں کی پابندی کرائے گی، اور تجارت کی آزادی برقرار رکھے گی، تو محنت اور بچت کی ترغیب کمزور پڑ جاتی ہے۔

---

[112] ایضاً، 1762 63–کی رپورٹ، 29 مارچ 1763 کا لیکچر، صفحہ 348۔

[113] ایضاً، 1766 کی تاریخ والی رپورٹ، صفحہ 487۔

قانونیات کے لیکچرز میں حکومت کی مداخلت پر اسمتھ کی تنقید The Wealth of Nations کے مقابلے میں زیادہ بے لاگ محسوس ہوتی ہے۔ اس میں معاہدات کے قانون کی کمزوریاں، زمین کی ملکیت کے مسائل، وراثت کے قدیم قانونِ اوّلادی حق، حکومت کی سبسڈیز اور اجارہ داریاں، اور وہ ضابطے شامل ہیں جو لوگوں کو پیشہ یا روزگار بدلنے سے روکتے ہیں۔

بھاری ٹیکس بھی ایک بڑی رکاوٹ ہیں۔ یہاں وہ ٹیکس کی کارکردگی پر غور کرتا ہے اور بعض جگہ اشیاء پر ٹیکس کے مقابلے میں زمین پر ٹیکس کو عملی طور پر آسان سمجھتا ہے۔ مجموعی طور پر وہ حد سے بڑھی ہوئی مرکزی منصوبہ بندی کے خلاف ہے۔ لوگوں کو منڈی اور آزاد تجارت کی ضرورت ہے، نہ کہ بالا سے جاری کردہ ہدایات کی۔

ایسی مداخلتیں لازماً عوامی فلاح کو کم کرتی ہیں، کیونکہ رضاکارانہ تبادلہ اسی لیے ہوتا ہے کہ دونوں فریق سمجھتے ہیں انہیں فائدہ ہوگا۔ یہی انسانی دولت کی بنیاد ہے۔ اسمتھ کے الفاظ میں جب دو آدمی تجارت کرتے ہیں تو یہ دونوں کے فائدے کے لیے ہوتی ہے، اور دو قوموں کے درمیان معاملہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔[114]

آزادی اور ترقی

اسمتھ کی پالیسی تجاویز بھی اسی منطق سے نکلتی ہیں۔ "مندرجہ بالا غور و فکر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ برطانیہ کو ہر صورت ایک آزاد بندرگاہ (فری پورٹ) بنایا جانا چاہیے، کہ غیر ملکی تجارت میں کسی بھی نوع کی کوئی رکاوٹ نہ ڈالی جائے، کہ اگر کسی اور طریقے سے حکومت کے اخراجات پورے کرنا ممکن ہو تو تمام ڈیوٹیاں، کسٹمز اور ایکسائز ختم کر دیے جائیں، اور یہ کہ تمام قوموں کے ساتھ اور ہر شے کے لیے آزاد تجارت اور تبادلے کی آزادی کی اجازت دی جائے۔"[115]

---

[114] ایضاً، 1766 کی تاریخ والی رپورٹ، صفحہ 511۔ وہی نکتہ وہ 1762–63 کی رپورٹ میں بھی بیان کرتے ہیں: 13 اپریل 1763 کا لیکچر، صفحہ 390۔

[115] ایضاً، 1766 کی تاریخ والی رپورٹ، صفحہ 514۔

حکومت کا کردار ان بنیادوں کو قائم رکھنے میں ضرور ہے، مگر اسے بلا ضرورت دولت پیدا کرنے کے عمل میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے، اور نہ ہی مفاد پرست گروہوں کو نظام بگاڑنے کی طاقت دینی چاہیے۔ جب راستہ صاف ہو جائے تو لوگوں کی اپنی حالت بہتر بنانے کی فطری خواہش ترقی کو آگے بڑھانے والی نہایت طاقتور قوت بن جاتی ہے۔

اختتامیہ

اسمتھ کی کم معروف تحریریں جدید قاری کے لیے اس وجہ سے چیلنج بن سکتی ہیں کہ ان میں علمی گہرائی غیر معمولی حد تک پائی جاتی ہے۔ ایک تحریر میں وہ مختلف تاریخی فلکیاتی تصورات پر نہایت واقف کارانہ اور تفصیلی گفتگو کرتا ہے؛ دوسری میں وہ متعدد کلاسیکی علما کے حوالے پیش کرتا ہے تاکہ یہ دکھا سکے کہ وہ زبان کو کس طرح استعمال کرتے تھے؛ اور ایک اور مقام پر وہ قریب و بعید کے مختلف ممالک کے قانونی اداروں کا باہم تقابل کرتا ہے۔

لیکن یہ تحریریں اسمتھ کی محض مختلف علمی شعبوں پر گرفت ہی کو ظاہر نہیں کرتیں، بلکہ اسے انسانی فطرت کے ایک سنجیدہ طالبِ علم کے طور پر بھی واضح کرتی ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ قوانین، حکومتیں، زبان یا حتیٰ کہ سائنس محض از خود «دی ہوئی» چیزیں ہیں۔ درحقیقت یہ سب انسانی ذہن کی تخلیقات ہیں۔

اس کے باوجود یہ پیچیدہ نظام ہیں، اور لازماً ایسے نہیں کہ ہم نے انہیں شعوری منصوبہ بندی کے تحت تشکیل دیا ہو۔ «غیر مرئی ہاتھ» پر غور کرنے والے مفکر کو جو چیز سب سے زیادہ مسحور کرتی ہے، وہ یہی ہے کہ ہمارے انفرادی اعمال کس طرح مل جل کر ان مؤثر سماجی اداروں کو جنم دیتے ہیں اور انہیں کارآمد بناتے ہیں۔

۶۔ غیر مرئی ہاتھ پر ایک ضمنی بحث

آدم اسمتھ اپنے ''غیر مرئی ہاتھ'' کے تصور کی وجہ سے مشہور ہے۔ زیادہ تر لوگ اس سے یہ مراد لیتے ہیں کہ ہماری خود غرضانہ سرگرمیاں کسی نہ کسی طرح مجموعی سماجی فائدہ پیدا کر دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر، ہماری سخت سودے بازی ایک ایسا منڈیاتی نظام تشکیل دیتی ہے جو وسائل کو بڑی مؤثریت کے ساتھ تقسیم کرتا ہے۔ لیکن حقیقت میں، The History of Astronomy میں ''مشتری کے غیر مرئی ہاتھ'' کے ایک ذکر کے علاوہ، اسمتھ نے اپنی تحریروں میں یہ اصطلاح صرف دو مرتبہ استعمال کی ہے، اور وہ بھی اس مفہوم میں نہیں جسے عام طور پر اس سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔

امیر، غریبوں کے لیے روزگار پیدا کرتے ہیں

The Theory of Moral Sentiments میں اسمتھ یہ خیال پیش کرتا ہے کہ ''عنایتِ الٰہی'' کا ہاتھ معاشی فوائد کو کسی حد تک برابر کر دیتا ہے۔ امیر لوگ غریبوں سے زیادہ کھا نہیں سکتے۔ اپنی زمین سے پیدا ہونے والی زیادہ تر خوراک کا ان کے لیے واحد مصرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اسے دوسروں کے ساتھ تبادلے میں دیں، یعنی ان لوگوں کے ساتھ جو وہ آسائشیں، وہ ''کھلونے اور نفیس اشیاء'' فراہم کرتے ہیں جن کی امیر خواہش رکھتے ہیں۔ محض اپنی ذات کا خیال رکھتے ہوئے بھی امیر ہزاروں لوگوں کے لیے روزگار پیدا کر دیتے ہیں۔ اسمتھ لکھتا ہے:

''امیر ڈھیر میں سے صرف وہی چیزیں منتخب کرتے ہیں جو سب سے زیادہ قیمتی اور خوشگوار ہوتی ہیں۔ وہ غریبوں کے مقابلے میں بہت کم زیادہ خرچ کرتے ہیں، اور اپنی فطری خود غرضی اور لالچ کے باوجود، اگرچہ ان کا مقصد صرف اپنی سہولت ہو، اگرچہ ان ہزاروں افراد کی محنت سے ان کا واحد ہدف اپنی لاحاصل اور نہ ختم ہونے والی خواہشات کی تسکین ہی ہو، وہ اپنی تمام تر بہتریوں کی پیداوار غریبوں کے ساتھ بانٹ دیتے ہیں۔ وہ ایک غیر مرئی ہاتھ کے زیرِ اثر زندگی کی ضروریات کی تقریباً وہی تقسیم کر دیتے ہیں جو اس صورت میں ہوتی اگر زمین اس کے تمام باشندوں میں برابر حصوں میں تقسیم کر دی گئی ہوتی؛

اور یوں وہ بلاارادہ اور بلا شعور معاشرے کے مفاد کو آگے بڑھاتے ہیں، اور نوعِ انسانی کی افزائش کے لیے وسائل فراہم کرتے ہیں۔"[116]

داخلی اور خارجی صنعت

The Wealth of Nations میں "غیر مرئی ہاتھ" کا واحد ذکر ایک ایسے اقتباس میں آتا ہے جو سرکاری اجارہ داریوں اور غیر ملکی تجارت کے مقابلے میں داخلی صنعتوں کے فروغ کے پس منظر میں ہے۔ اسمتھ یہ بتاتا ہے کہ لوگ اپنی سلامتی اور اپنے مفاد کے تحت عموماً سرمایہ ملکی صنعت میں لگاتے ہیں، اور پھر نتیجہ یہ نکلتا ہے:

"چونکہ ہر فرد، حتی المقدور، اپنی کوشش اس بات پر صرف کرتا ہے کہ اپنا سرمایہ ملکی صنعت کی اعانت میں لگائے، اور اس صنعت کو اس انداز میں سمت دے کہ اس کی پیداوار زیادہ سے زیادہ قدر کی حامل ہو، اس لیے ہر فرد لازماً اس بات کے لیے محنت کرتا ہے کہ معاشرے کی سالانہ آمدنی کو جہاں تک ہو سکے بڑھا دے۔ وہ عموماً نہ تو عوامی مفاد کو فروغ دینے کا ارادہ رکھتا ہے اور نہ ہی یہ جانتا ہے کہ وہ اسے کس قدر بڑھا رہا ہے۔ جب وہ غیر ملکی صنعت کے مقابلے میں ملکی صنعت کی حمایت کو ترجیح دیتا ہے تو اس کا مقصد صرف اپنی سلامتی ہوتا ہے؛ اور جب وہ صنعت کو اس طرح منظم کرتا ہے کہ اس کی پیداوار زیادہ سے زیادہ قدر رکھتی ہو تو اس کا مقصد محض اپنا فائدہ ہوتا ہے۔ اور اس میں، جیسے بہت سے دیگر معاملات میں، وہ ایک "غیر مرئی ہاتھ" کے ذریعے ایسے مقصد کو فروغ دے رہا ہوتا ہے جو اس کے ارادے کا حصہ نہیں ہوتا۔"[117]

یہ دونوں اقتباسات بعض ناقدین کو اس نتیجے تک پہنچاتے ہیں کہ اسمتھ کا "غیر مرئی ہاتھ" والا تصور اس عام فہم معنی سے خاصا مختلف ہے جو آج اس کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے۔ ایک جگہ خود غرضی کے

---

[116] تھیوری آف مورل سینٹیمنٹس، حصہ چہارم، باب اوّل، صفحات 184–185، پیرا گراف 10۔

[117] دی ویلتھ آف نیشنز، کتاب چہارم، باب دوم، صفحہ 456، پیرا گراف 9۔

خوش گوار نتائج کو ''عنایتِ الٰہی'' کی طرف منسوب کیا گیا ہے، اور دوسری جگہ یہ اصطلاح برآمدی تجارت سے متعلق بحث کے دوران ایک ضمنی نکتے کے طور پر سامنے آتی ہے۔

انسانی اعمال کے غیر ارادی نتائج

لیکن اس معاملے کو محض ان دو حوالوں تک محدود کرنا درست نہیں۔ ''غیر مرئی ہاتھ'' کا بنیادی مفہوم اسمتھ کی پوری فکر میں سرایت کیے ہوئے ہے، اور یہ تصور اس صورت میں بھی موجود رہتا اگر ان دو مخصوص جگہوں پر یہ اصطلاح کبھی استعمال ہی نہ ہوتی۔ وجہ یہ ہے کہ یہ اصطلاح اسمتھ کے ایک بنیادی خیال کا نہایت سادہ اور جامع خلاصہ ہے: انسانی اعمال کے غیر ارادی نتائج بھی ہوتے ہیں۔

اور یہ کہ اگر چند بنیادی قواعد، خصوصاً انصاف کے اصول، برقرار رہیں تو افراد کے ذاتی مفاد سے محرک اعمال بھی بلا ارادہ ایک ایسا مجموعی سماجی نظم تشکیل دے سکتے ہیں جو مؤثر بھی ہو اور مجموعی طور پر فائدہ مند بھی۔

جب میں ایک اُونی کوٹ خریدتا ہوں[118]، اسمتھ کی مثال کے مطابق، تو میں یہ کام اپنے فائدے کے لیے کرتا ہوں۔ دکان دار کی فلاح و بہبود سے مجھے زیادہ سروکار نہیں ہوتا، اور بُننے والوں، چرواہوں، اون کترنے والوں، کنگھی کرنے والوں، رنگریزوں، سوت کاتنے والوں، اوزار بنانے والوں، مال برداروں اور دوسرے بے شمار لوگوں کے بارے میں تو اس سے بھی کم، جن سے میری غالباً کبھی ملاقات بھی نہیں ہوگی۔ اسی طرح، ان میں سے کوئی شخص یہ کوٹ مجھے خوش کرنے کے لیے تیار نہیں کرتا۔ ان کی توجہ زیادہ تر اس بات پر ہوتی ہے کہ وہ کمائیں، تاکہ اپنے گھر کا نظام چلا سکیں۔

اور اس کے باوجود، میری یہ خریداری ان سب کے لیے فائدہ مند بنتی ہے، کیونکہ جو رقم میں ادا کرتا ہوں، اس کا کوئی نہ کوئی حصہ مختلف راستوں سے بالآخر ان تک پہنچ جاتا ہے۔ اور اسی طرح ان سب کی محنت مجھے ایک ایسا بہتر اور سستا لباس مہیا کرتی ہے جو میں خود کبھی تیار نہیں کر سکتا تھا۔

---

[118] ایضاً، کتاب اوّل، باب اوّل، صفحہ 22، پیرا گراف 11۔

یہ بظاہر کسی معجزے جیسا لگتا ہے کہ مختلف ملکوں میں پھیلے ہوئے ہزاروں افراد کی محنت اس قدر خود کار انداز میں باہم ہم آہنگ ہو جاتی ہے، بغیر کسی مرکزی ہدایت دینے والے اختیار کے، اور محض اس عمل میں شامل ہر شخص کے ذاتی مفاد کے تحت۔ لیکن اسمتھ اس کی نہایت سادہ وضاحت دیتا ہے۔ رضاکارانہ تبادلہ صرف اسی وقت ہوتا ہے جب دونوں فریق یہ توقع رکھتے ہوں کہ انہیں اس سودے سے فائدہ ہوگا۔ ہر فریق وہ چیز دیتا ہے جس کی اسے نسبتاً کم ضرورت ہوتی ہے، اور اس کے بدلے وہ چیز حاصل کرتا ہے جسے وہ زیادہ چاہتا ہے، مثلاً محنت کے بدلے پیسہ، یا پیسے کے بدلے اشیاء۔

جب لاکھوں لوگ اسی اصول پر ایک دوسرے کے ساتھ تبادلہ کرتے ہیں تو فائدہ پورے معاشرے میں بہت وسیع پیمانے پر پھیلتا ہے۔ اسی دوران قیمتیں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ لوگ کسی خاص شے یا خدمت کے بدلے کتنی قربانی دینے کو تیار ہیں۔ یہی قیمتیں اشارہ دیتی ہیں کہ زیادہ منافع کے لیے محنت اور سرمایہ کس سمت میں لگایا جائے۔ اور یوں، خود کار طور پر مگر غیر ارادی طور پر، وسائل بتدریج وہاں منتقل ہوتے رہتے ہیں جہاں انہیں زیادہ مؤثر استعمال کیا جا سکتا ہو۔

خود کو برقرار رکھنے والا نظام

اسمتھ کو اس سماجی نظام کی فطری اور خود کو برقرار رکھنے والی نوعیت کا کچھ نہ کچھ ادراک تھا۔ The Theory of Moral Sentiments میں وہ اسے کبھی خدا یا عنایتِ الٰہی کی طرف منسوب کرتا ہے، اور کبھی فطرت کی طرف۔ تاہم بعد کے زمانے میں یہ خیال زیادہ نمایاں ہوتا دکھائی دیتا ہے کہ یہ ایک فطری، خود کو برقرار رکھنے والا نظام ہے۔[119]

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم جو چاہیں کرتے رہیں اور ''غیر مرئی ہاتھ'' خود ہی سب کچھ درست کر دے گا۔ اسمتھ اس بات سے بخوبی آگاہ ہے کہ انسان خود غرض، حسد کرنے والا، خود پسند اور کینہ پرور ہو سکتا ہے۔ جب یہ رجحانات حد سے بڑھ جائیں تو تباہ کن بن جاتے ہیں؛ لیکن اعتدال میں ہوں تو اہم

---

[119] میں اس مشاہدے پر پروفیسر گیون کینیڈی کا شکر گزار ہوں۔

سماجی کردار ادا کرتے ہیں۔ خود غرضی ہمیں سودے بازی پر آمادہ کرتی ہے، اور یوں ضمنی طور پر دوسروں کو فائدہ پہنچتا ہے۔

امیروں سے حسد ہمیں جدوجہد پر اکساتا ہے، جو اتفاقاً صنعت، سائنس اور فنون کی ترقی کا سبب بنتا ہے۔ دوسروں کی نظر میں اچھا دکھائی دینے کی خواہش ہمیں احسان کے کاموں کی طرف مائل کر سکتی ہے۔ اور دوسروں کی ناراضی سے بچنے کا جذبہ ہمیں انہیں نقصان پہنچانے سے روکتا ہے۔

انفرادی عمل اور سماجی نتائج

لیکن اس سماجی نظام کے ہموار اور خودکار طور پر چلنے کے لیے کچھ قواعد کی پابندی ضروری ہے: انصاف کے قواعد، جو ہمیں دوسروں کو نقصان پہنچانے سے روکتے ہیں؛ اخلاقیات کے قواعد، جو ہمیں بے لگام خواہشات پر قابو رکھنے کی تلقین کرتے ہیں؛ اور معاشی دائرے میں ملکیت اور معاہدے کے قواعد۔

انفرادی طرزِ عمل کے یہی قواعد مل جل کر ایک ایسا سماجی نظم تشکیل دیتے ہیں جو مجموعی طور پر فائدہ مند ہوتا ہے۔ ہم شاید یہ پوری طرح نہ سمجھ سکیں کہ یہ عمل ٹھیک کس طرح انجام پاتا ہے، لیکن اسمتھ کے نزدیک ہماری فطری جبلّت اور سماجی میلان، ہماری محدود عقل کے مقابلے میں، اکثر زیادہ قابلِ اعتماد رہنما ثابت ہوتے ہیں۔

زیادہ حال ہی میں، نوبل انعام یافتہ ماہرِ معیشت ایف۔ اے۔ ہائیک نے یہ خیال — کہ بغیر کسی مرکزی حکم یا کمان کے بھی ہم آہنگ سماجی نظام وجود میں آ سکتے ہیں —[120] اس کی جڑیں اسمتھ تک اور اس سے بھی پہلے تک جا کر تلاش کیں۔ ارتقا اور نفسیات کی جدید سمجھ کے ساتھ ہائیک نے واضح کیا کہ سماجی

---

[120] دیکھیے: ایف۔ اے۔ ہائیک، اسٹڈیزاِن فلاسفی، پولیٹکس اینڈ اکنامکس، سائمن اینڈ شسٹر، نیویارک، 1967، باب 6، 'انسانی عمل کے نتائج، مگر انسانی منصوبہ بندی کے نہیں'، صفحات 96–105۔ ایک آسان فہم تعارف کے لیے دیکھیے: ای۔ بٹلر، ہائیک: ہمارے عہد کی سیاسی اور معاشی فکر میں اُن کی خدمات، ٹیمپل اسمتھ، لندن، 1983، باب 1، 'یہ سمجھنا کہ معاشرہ کیسے کام کرتا ہے'۔

گروہ کیسے خوشحال ہو سکتے ہیں، اور محض انفرادی طرزِ عمل کی چند باقاعدگیوں کی پیروی کرتے ہوئے—بے خبری میں—ایک ایسا نظم پیدا کر سکتے ہیں جو ہمواری سے چلتا رہے۔[121]

مثال کے طور پر زبان میں، ہم غیر ارادی طور پر ایک نہایت مؤثر نظامِ ابلاغ تشکیل دیتے ہیں، صرف گرامر کے چند قواعد کی پیروی سے—ایسے قواعد جن پر ہم فطری طور پر عمل کرتے ہیں، مگر اُن کی پوری وضاحت کرنا ہمارے لیے مشکل ہوتا ہے۔ اسمتھ، ظاہر ہے، زبان کے بارے میں اپنے تبصروں میں اسی تصور کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔[122]

اس مفید سماجی نظم کی بنیاد ہمارے ایک ساتھ رہنا سیکھنے میں ہے۔ ہم سب اپنی خواہشات پوری کرنا چاہتے ہیں، مگر اکثر ہماری خواہشات دوسروں کی خواہشات سے ٹکرا جاتی ہیں۔ رفتہ رفتہ ہم یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ کون سے اعمال دوسروں کے نزدیک قابلِ برداشت ہیں اور تباہ کن تشدد کا باعث نہیں بنتے۔ یوں، ایک فطری انسانی ہمدردی کی مدد سے، ہم انصاف کے وہ قواعد اخذ کر لیتے ہیں جن کے تحت ہم دوسروں کو نقصان پہنچائے بغیر اپنے مفادات کا تعاقب کر سکتے ہیں۔[123] صرف معاشی دائرے میں ہی نہیں بلکہ دیگر سماجی تعاملات میں بھی ہم ایسے طریقوں سے تعاون کرنا سیکھتے ہیں جو ہم سب کے لیے فائدہ مند ہوتے ہیں—اگرچہ یہ ہمارے ارادے کا حصہ نہیں ہوتا۔

---

[121] ہائیک، اسٹڈیز اِن فلاسفی، باب 4، 'طرزِ عمل کے قواعد کے ارتقا پر نوٹس'، صفحات 66–81۔

[122] دیکھیے: لیکچرز آن ریٹورک اینڈ بیلز لیٹرز۔

[123] تھیوری آف مورل سینٹیمنٹس، حصہ دوم، دفعہ دوم، باب سوم۔

۷۔آدم اسمتھ کے منتخب اقتباسات

آدم اسمتھ کے اقوال کے ایک وسیع تر انتخاب کے لیے ملاحظہ کیجیے:

جے۔ہیگارٹی، The Wisdom of Adam Smith، لبرٹی فنڈ، انڈیاناپولس، 1976۔

محنت کی تقسیم کے بارے میں

مختلف فنون کی تمام پیداوار میں جو عظیم اضافہ محنت کی تقسیم کے نتیجے میں ہوتا ہے، وہی ایک اچھی طرح منظم معاشرے میں اس ہمہ گیر خوشحالی کا سبب بنتا ہے جو معاشرے کے سب سے نچلے طبقوں تک پھیل جاتی ہے۔

The Wealth of Nations، کتاب اوّل، باب اوّل، صفحہ 22، پیرا گراف 10

تقابلی برتری کے بارے میں

شیشے کے گھروں، گرم خانوں اور گرم دیواروں کے ذریعے اسکاٹ لینڈ میں نہایت اچھی انگور کی پیداوار ممکن ہے، اور ان سے اچھی شراب بھی تیار کی جاسکتی ہے؛ مگر اس لاگت پر جو کم از کم تیس گنا زیادہ ہوگی اُس لاگت کے مقابلے میں جس پر اتنی ہی اچھی شراب غیر ملکی ممالک سے منگوائی جاسکتی ہے۔ کیا یہ کوئی معقول قانون ہوگا کہ محض اسکاٹ لینڈ میں کلاریٹ اور برگنڈی تیار کرنے کی حوصلہ افزائی کے لیے تمام غیر ملکی شرابوں کی درآمد پر پابندی لگادی جائے؟

The Wealth of Nations، کتاب چہارم، باب دوم، صفحہ 458، پیرا گراف 15

یہ ہر سمجھ دار گھر کے سربراہ کا اصول ہوتا ہے کہ وہ کبھی یہ کوشش نہ کرے کہ گھر میں وہ چیز تیار کرے جسے خریدنا اس کے لیے خود بنانے سے سستا پڑتا ہو... جو بات ہر نجی خاندان کے طرزِ عمل میں دانش مندی سمجھی جاتی ہے، وہ کسی عظیم سلطنت کے معاملے میں مشکل ہی سے حماقت ہوسکتی ہے۔

The Wealth of Nations، کتاب چہارم، باب دوم، صفحات 456–457، پیرا گراف 12–11

مسابقت کے بارے میں

عمومی طور پر، اگر تجارت کی کوئی شاخ یا محنت کی کوئی تقسیم عوام کے لیے فائدہ مند ہو، تو جتنی زیادہ آزاد اور جتنی زیادہ وسیع پیمانے پر مسابقت ہوگی، وہ اتنی ہی زیادہ فائدہ مند ثابت ہوگی۔
The Wealth of Nations، کتاب دوم، باب دوم، صفحہ 329، پیرا گراف 106

تمام پیداوار کا واحد مقصد اور غایت کھپت ہے؛ اور پیدا کرنے والے کے مفاد کا خیال صرف اسی حد تک رکھا جانا چاہیے جس حد تک وہ صارف کے مفاد کو فروغ دینے کے لیے ضروری ہو۔
The Wealth of Nations، کتاب چہارم، باب ہشتم، صفحہ 660، پیرا گراف 49

تجارت میں بگاڑ اور کارٹیلائزیشن کے بارے میں

ایک ہی پیشے سے وابستہ لوگ شاذ و نادر ہی محض تفریح یا خوش گپی کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں؛ ایسی محفلیں عموماً عوام کے خلاف کسی سازش پر، یا قیمتیں بڑھانے کی کسی ترکیب پر منتج ہو جاتی ہیں... اگرچہ قانون ایک ہی پیشے کے لوگوں کو کبھی کبھار اکٹھا ہونے سے روک نہیں سکتا، لیکن اسے ایسا کوئی کام بھی نہیں کرنا چاہیے جو ایسی مجالس کو آسان بنائے، اور نہ ہی انہیں ضروری قرار دے۔
The Wealth of Nations، کتاب چہارم، باب ہشتم، صفحہ 145، پیرا گراف c27

ایسا ضابطہ جو کسی مخصوص شہر میں ایک ہی پیشے سے وابستہ تمام افراد کو پابند کرے کہ وہ اپنے نام اور رہائش کی جگہیں کسی سرکاری رجسٹر میں درج کرائیں، ایسی مجالس کو آسان بنا دیتا ہے. ایسا ضابطہ جو ایک ہی پیشے کے افراد کو یہ اختیار دے کہ وہ اپنے غریبوں، بیماروں، بیواؤں اور یتیموں کے لیے چندہ یا ٹیکس عائد کریں... ایسی مجالس کو ناگزیر بنا دیتا ہے۔

اور کسی پیشے کی باقاعدہ تنظیم نہ صرف ایسی مجالس کو ضروری بنا دیتی ہے، بلکہ اکثریت کے فیصلے کو پوری جماعت پر لازم بھی کر دیتی ہے۔ آزاد تجارت میں کوئی مؤثر گٹھ جوڑ صرف اسی صورت قائم ہو سکتا ہے جب ہر ایک تاجر کی متفقہ رضامندی حاصل ہو، اور وہ بھی اسی وقت تک قائم رہ سکتا ہے جب تک ہر ایک تاجر اسی رائے پر قائم رہے۔ لیکن کسی کارپوریشن کی اکثریت مناسب سزاؤں کے ساتھ ایک ذیلی

قانون نافذ کر سکتی ہے، جو مسابقت کو کسی بھی رضاکارانہ گٹھ جوڑ کے مقابلے میں کہیں زیادہ مؤثر اور دیرپا انداز میں محدود کر دے۔

The Wealth of Nations، کتاب چہارم، باب ہشتم، صفحہ 145، پیرا گراف c29–30

منڈی کو وسیع کرنا اور مسابقت کو محدود کرنا ہمیشہ تاجروں کے مفاد میں ہوتا ہے... تجارت سے متعلق کسی بھی نئے قانون یا ضابطے کی تجویز، اگر اسی طبقے کی طرف سے آئے، تو اسے ہمیشہ نہایت احتیاط کے ساتھ سنا جانا چاہیے، اور اسے اس وقت تک ہرگز نافذ نہیں کیا جانا چاہیے جب تک اس کا طویل اور باریک بینی سے جائزہ نہ لے لیا جائے، نہ صرف انتہائی دقیق بلکہ نہایت مشکوک نگاہ سے بھی۔ یہ ایسی جماعت کی طرف سے آتی ہے جس کا مفاد کبھی بھی عوامی مفاد سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں ہوتا؛ جن کا عموماً مفاد اس بات میں ہوتا ہے کہ وہ عوام کو دھوکہ دیں، بلکہ حتیٰ کہ ان پر جبر کریں؛ اور جو واقعی متعدد مواقع پر عوام کو دھوکہ دے چکے ہیں اور ان پر ظلم کر چکے ہیں۔

The Wealth of Nations، کتاب اوّل، باب یازدہم، صفحہ 267، پیرا گراف 10

حکومت کے بارے میں

یہ بادشاہوں اور وزیروں کی انتہائی گستاخی اور خود پسندی ہے کہ وہ نجی افراد کی معیشت پر نگاہ رکھنے اور ان کے اخراجات کو محدود کرنے کا دعویٰ کریں... حالانکہ وہ خود ہمیشہ، اور بغیر کسی استثنا کے، پورے معاشرے میں سب سے بڑے فضول خرچ ہوتے ہیں۔ انہیں چاہیے کہ اپنے اخراجات کی اچھی طرح نگرانی کریں، اور پھر وہ نجی افراد کو ان کے اپنے اخراجات کے معاملے میں بے خوفی سے چھوڑ سکتے ہیں۔ اگر ان کی اپنی اسراف پسندی ریاست کو تباہ نہیں کرتی، تو ان کے رعایا کی اسراف پسندی کبھی نہیں کرے گی۔

The Wealth of Nations، کتاب دوم، باب سوم، صفحہ 346، پیرا گراف 36

وہ ریاست دان جو یہ کوشش کرے کہ نجی افراد کو یہ ہدایت دے کہ انہیں اپنے سرمائے کو کس انداز میں استعمال کرنا چاہیے، وہ نہ صرف اپنے اوپر ایک بالکل غیر ضروری بوجھ ڈال لے گا، بلکہ ایسے اختیار کا دعویٰ بھی کرے گا جسے نہ تو کسی ایک فرد کے سپرد کرنا محفوظ ہے، نہ ہی کسی کونسل یا سینیٹ کے۔ اور یہ

اختیار کہیں بھی اتنا خطرناک نہیں ہوگا جتنا اُس شخص کے ہاتھ میں جو اس قدر حماقت اور خود پسندی رکھتا ہو کہ خود کو اس کے استعمال کے لیے موزوں سمجھ بیٹھے۔

The Wealth of Nations، کتاب چہارم، باب دوم، صفحہ 456، پیرا گراف 10

ٹیکسیشن کے بارے میں

کوئی فن ایسا نہیں جسے ایک حکومت دوسری حکومت سے اتنی جلدی سیکھ لیتی ہو جتنا کہ عوام کی جیبوں سے پیسہ نکالنے کا فن۔

The Wealth of Nations، کتاب پنجم، باب دوم، حصہ دوم، دفعات اوّل و دوم کے ضمیمے میں، صفحہ 861، پیرا گراف 12

ہر ریاست کے رعایا کو چاہیے کہ حکومت کے اخراجات کی اعانت میں، جہاں تک ممکن ہو، اپنی اپنی استعداد کے تناسب سے حصہ ڈالیں

The Wealth of Nations، کتاب پنجم، باب دوم، حصہ دوم، دفعہ v.ii ، صفحہ 825، پیرا گراف 3

ہر فرد پر لازم ٹیکس یقینی ہونا چاہیے، من مانا نہیں۔ ادائیگی کا وقت، ادائیگی کا طریقہ، اور ادا کی جانے والی رقم، یہ سب باتیں ٹیکس ادا کرنے والے کے لیے بھی اور ہر دوسرے شخص کے لیے بھی واضح اور صاف ہونی چاہئیں ... The Wealth of Nations ، کتاب پنجم، باب دوم، حصہ دوم، صفحہ 825، پیرا گراف 4

ہر ٹیکس اس وقت یا اس طریقے سے عائد کیا جانا چاہیے جس میں اس کے ادا کرنے والے کے لیے ادائیگی سب سے زیادہ سہل اور موزوں ہو.

The Wealth of Nations، کتاب پنجم، باب دوم، حصہ دوم، صفحہ 826، پیرا گراف 5

ہر ٹیکس اس طرح وضع کیا جانا چاہیے کہ وہ ریاست کے عوامی خزانے میں جتنی رقم لاتا ہے، اس سے زیادہ عوام کی جیبوں سے ممکنہ حد تک کم سے کم رقم نکالے اور باہر رکھے...

The Wealth of Nations، کتاب پنجم، باب دوم، حصہ دوم، صفحہ 826، پیرا گراف 6

سرمایہ کا مالک لازماً دنیا کا شہری ہوتا ہے، اور ضروری نہیں کہ وہ کسی ایک مخصوص ملک سے وابستہ ہو۔ جس ملک میں اسے پریشان کن تفتیش کا سامنا ہو اور جہاں اس پر بھاری ٹیکس عائد کیا جائے، وہاں سے وہ غالباً کوچ کر جائے گا، اور اپنا سرمایہ کسی ایسے دوسرے ملک میں منتقل کر دے گا جہاں وہ یا تو اپنا کاروبار زیادہ آسانی سے چلا سکے، یا کم جھنجھٹ کے ساتھ اپنی دولت سے لطف اندوز ہو سکے۔

The Wealth of Nations، کتاب پنجم، باب دوم، مضمون دوم، صفحات 848–849، پیرا گراف f8

سبسڈیز کے بارے میں

سفید ہرنگ کی ماہی گیری پر دی جانے والی رعایت ایک ٹنّیج باؤٹی ہے؛ یعنی یہ جہاز کے وزن کے تناسب سے دی جاتی ہے، نہ کہ ماہی گیری میں اس کی محنت یا کامیابی کے مطابق۔ اور مجھے اندیشہ ہے کہ یہ بات خاصی عام ہو چکی ہے کہ بعض جہاز صرف اس مقصد کے لیے روانہ کیے جاتے ہیں کہ وہ مچھلی نہیں، بلکہ باؤٹی حاصل کریں۔

The Wealth of Nations، کتاب چہارم، باب پنجم، صفحہ 520، پیرا گراف 32

درآمدی پابندیوں اور جوابی محصولات کے بارے میں

جس طرح ایک امیر آدمی اپنے پڑوس کے محنتی لوگوں کے لیے ایک غریب آدمی کے مقابلے میں بہتر گاہک ثابت ہوتا ہے، اسی طرح ایک امیر قوم بھی۔ [تجارتی پابندیاں] اپنے تمام پڑوسیوں کو غریب بنانے کا ہدف لے کر، اسی تجارت کو حقیر اور بے وقعت بنا دیتی ہیں۔

The Wealth of Nations، کتاب چہارم، باب سوم، حصہ دوم، صفحہ 495، پیرا گراف c11

اس بات کا فیصلہ کرنا کہ ایسی جوابی کارروائیاں، یعنی اُن ممالک کے خلاف عائد کردہ محصولات جو خود زیادہ محصولات لگاتے ہیں، واقعی ایسا اثر پیدا کریں گی یا نہیں، شاید کسی قانون ساز کے علم سے اتنا متعلق نہیں، جس کی غور و فکر ہمیشہ ایک جیسے رہنے والے عمومی اصولوں کے تحت ہونی چاہیے، جتنا کہ اُس

مکار اور چالاک جانور کی مہارت سے، جسے عام طور پر ریاست دان یا سیاست دان کہا جاتا ہے، اور جس کے مشورے حالات کے لمحہ بہ لمحہ اتار چڑھاؤ کے تابع ہوتے ہیں۔

The Wealth of Nations، کتاب چہارم، باب دوم، صفحہ 468، پیرا گراف 39

مراعات اور بگڑی ہوئی مراعات کے بارے میں

عوامی خدمات کبھی بھی اس سے بہتر طور پر انجام نہیں پاتیں جتنا اس صورت میں جب ان کا اجر انہی خدمات کی انجام دہی کے نتیجے میں ملے، اور اس محنت و لگن کے تناسب سے ہو جو انہیں انجام دینے میں صرف کی گئی ہو۔

The Wealth of Nations، کتاب پنجم، باب اوّل، حصہ دوم، صفحہ 719، پیرا گراف 20

ہر انسان کا مفاد اس بات میں ہوتا ہے کہ وہ جتنا ممکن ہو آرام سے زندگی بسر کرے؛ اور اگر اس کے معاوضات بالکل یکساں رہیں، خواہ وہ کوئی نہایت مشقت طلب فرض انجام دے یا نہ دے، تو بلاشبہ اس کے مفاد میں یہی ہو گا کہ وہ یا تو اسے بالکل نظر انداز کر دے، یا پھر اسے لاپرواہی اور بے ڈھنگے انداز میں انجام دے۔

The Wealth of Nations، کتاب پنجم، باب اوّل، حصہ سوم، مضمون دوم، صفحہ 760، پیرا گراف f7

انصاف کے بارے میں

اگر [انصاف] کو ہٹا دیا جائے تو انسانی معاشرے کی عظیم، بلکہ بے حد عظیم عمارت... ایک ہی لمحے میں ذرات میں بکھر جائے گی۔

The Theory of Moral Sentiments، حصہ دوم، باب دوم، فصل سوم، صفحہ 86، پیرا گراف 4

کسی ریاست کو بدترین بربریت سے بلند ترین خوشحالی تک پہنچانے کے لیے بہت کم چیزیں درکار ہوتی ہیں: امن، آسان ٹیکس، اور انصاف کی قابلِ قبول عمل داری؛ باقی سب کچھ فطری اسباب کے تحت خود بخود وجود میں آجاتا ہے۔

1755 کا لیکچر، ڈگالڈ اسٹیورٹ کی کتاب Account of the Life and Writings of Adam Smith, LLD، حصہ چہارم، پیرا گراف 25 سے منقول

انسانی ہمدردی کے بارے میں

خواہ انسان کو کتنا ہی خود غرض کیوں نہ سمجھا جائے، اس کی فطرت میں کچھ ایسے اصول بہر حال موجود ہیں جو اسے دوسروں کی حالت سے دلچسپی لینے پر آمادہ کرتے ہیں، اور دوسروں کی خوشی کو اس کے لیے ضروری بنا دیتے ہیں، اگرچہ اس خوشی سے اسے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا، سوائے اسے دیکھنے کی مسرت کے۔

The Theory of Moral Sentiments، حصہ اوّل، باب اوّل، فصل اوّل، صفحہ 9، پیرا گراف 1

بہتری کی فطری جستجو کے بارے میں

ہر فرد کی اپنی حالت بہتر بنانے کی فطری کوشش... اتنی طاقت ور ہوتی ہے کہ وہ تنِ تنہا، اور بغیر کسی بیرونی مدد کے، نہ صرف معاشرے کو دولت اور خوشحالی کی طرف لے جانے کی صلاحیت رکھتی ہے، بلکہ اُن بے شمار فضول رکاوٹوں پر بھی غالب آسکتی ہے جن سے انسانی قوانین کی حماقت اکثر اس کے عمل کو بوجھل بنا دیتی ہے۔

The Wealth of Nations، کتاب چہارم، باب پنجم، اناج کی تجارت پر ضمنی بحث، صفحہ 540، پیرا گراف b43

غیر مرئی ہاتھ کے بارے میں

[امیر لوگ] غریبوں کے مقابلے میں بہت کم زیادہ خرچ کرتے ہیں، اور اپنی فطری خود غرضی اور حرص کے باوجود... اپنی تمام تر بہتریوں کی پیداوار غریبوں کے ساتھ بانٹ دیتے ہیں۔ وہ ایک ''غیر مرئی ہاتھ'' کے زیرِ اثر زندگی کی ضروریات کی تقریباً وہی تقسیم کر دیتے ہیں جو اس صورت میں ہوتی اگر زمین اس کے تمام باشندوں میں برابر حصوں میں تقسیم کر دی گئی ہوتی؛ اور یوں بلا ارادہ اور بلا شعور معاشرے کے مفاد کو آگے بڑھاتے ہیں، اور نوعِ انسانی کی افزائش کے لیے وسائل فراہم کرتے ہیں۔

The Theory of Moral Sentiments، حصہ چہارم، باب اوّل، صفحات 184–185، پیرا گراف 10

ہر فرد... نہ تو عوامی مفاد کو فروغ دینے کا ارادہ رکھتا ہے، اور نہ ہی یہ جانتا ہے کہ وہ اسے کس قدر آگے بڑھا رہا ہے... اس کا مقصد صرف اپنی سلامتی ہوتا ہے؛ اور جب وہ اپنی صنعت کو اس طرح سمت دیتا ہے کہ اس کی پیداوار زیادہ سے زیادہ قدر کی حامل ہو، تو اس کا مقصد محض اپنا فائدہ ہوتا ہے۔ اور اس میں، جیسے بہت سے دیگر معاملات میں، وہ ایک ''غیر مرئی ہاتھ'' کے ذریعے ایسے مقصد کو آگے بڑھاتا ہے جو اس کے ارادے کا حصہ نہیں ہوتا۔

The Wealth of Nations، کتاب چہارم، باب دوم، صفحہ 456، پیرا گراف 9

ہمیں اپنا کھانا قصاب، شراب بنانے والے یا نان بائی کی خیر خواہی سے حاصل ہونے کی توقع نہیں ہوتی، بلکہ ان کے اپنے مفاد کے خیال سے ہوتی ہے۔ ہم ان سے اپنی انسانیت کی بنیاد پر بات نہیں کرتے بلکہ ان کی خود غرضی کو مخاطب کرتے ہیں، اور ہم کبھی ان سے اپنی ضرورتوں کا ذکر نہیں کرتے بلکہ ان کے فائدے کی بات کرتے ہیں۔

The Wealth of Nations، کتاب اوّل، باب دوم، صفحات 26–27، پیرا گراف 12

منصوبہ بندی اور ''نظام کے آدمی'' کے بارے میں

نظام کا آدمی عموماً اپنے ہی تصور میں خود کو بہت دانا سمجھتا ہے؛ اور اکثر اپنی تجویز کردہ مثالی حکومتی منصوبے کی مبینہ خوب صورتی پر اس قدر فریفتہ ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے کسی بھی حصے میں معمولی سی بھی تبدیلی برداشت نہیں کر پاتا۔ اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ایک عظیم معاشرے کے مختلف افراد کو اتنی ہی آسانی سے ترتیب دے سکتا ہے جتنی آسانی سے ہاتھ شطرنج کے تختے پر مختلف مہروں کو سجا دیتا ہے۔ وہ اس بات پر غور نہیں کرتا کہ انسانی معاشرے کی اس عظیم شطرنج میں ہر ایک مہرہ اپنی حرکت کا ایک الگ اصول رکھتا ہے، جو اُس اصول سے بالکل مختلف ہوتا ہے جسے قانون ساز اس پر مسلط کرنا چاہتا ہے۔

The Theory of Moral Sentiments، حصہ ششم، باب دوم، فصل دوم، صفحات 234–233، پیرا گراف 17

جامعات کے بارے میں

آکسفورڈ یونیورسٹی میں سرکاری اساتذہ کی اکثریت نے کئی برسوں سے نہ صرف تدریس کا فریضہ ترک کر دیا ہے، بلکہ تدریس کا محض دکھاوا تک بھی چھوڑ دیا ہے۔

The Wealth of Nations، کتاب پنجم، باب اوّل، حصہ سوم، مضمون دوم، صفحہ 761، پیرا گراف 8

کالجوں اور جامعات کا نظم و ضبط عموماً طلبہ کے فائدے کے لیے نہیں، بلکہ اساتذہ کے مفاد کے لیے، یا زیادہ درست طور پر کہا جائے تو ان کی سہولت کے لیے، وضع کیا جاتا ہے۔

The Wealth of Nations، کتاب پنجم، باب اوّل، حصہ سوم، مضمون دوم، صفحہ 764، پیرا گراف 15

دولت کی تقسیم اور پیسے کی قلت کے بارے میں

جو چیز اکثریت کے حالات بہتر بناتی ہے، وہ کبھی بھی مجموعی معاشرے کے لیے باعثِ زحمت نہیں سمجھی جاسکتی۔ کوئی معاشرہ یقیناً خوش حال اور خوش نصیب نہیں ہو سکتا جس کے اراکین کی بہت بڑی اکثریت غریب اور بدحال ہو۔

The Wealth of Nations، کتاب اوّل، باب ہشتم، صفحہ 96، پیرا گراف 36

تاہم کوئی شکایت پیسے کی قلت کی شکایت سے زیادہ عام نہیں۔

The Wealth of Nations، کتاب چہارم، باب اوّل، صفحہ 437، پیرا گراف 16

آزادی کے فوائد کے بارے میں

[تجارتی پابندیوں کے بغیر] فطری آزادی کا واضح اور سادہ نظام خود بخود قائم ہو جاتا ہے۔ ہر شخص کو پوری طرح آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے مفاد کو اپنے ہی طریقے سے حاصل کرے...اس طرح حکمران ایک ایسے فریضے سے مکمل طور پر سبک دوش ہو جاتا ہے جس کے لیے کبھی بھی انسانی حکمت یا علم کافی نہیں ہو سکتا تھا؛ یعنی نجی افراد کی صنعت کی نگرانی کرنے اور اسے معاشرے کے مفاد کے مطابق سمت دینے کا فریضہ۔

The Wealth of Nations، کتاب چہارم، باب نہم، صفحہ 687، پیرا گراف 51

منتخب کتب نامہ

آدم اسمتھ کی تصانیف اور مراسلت کا گلاسگو ایڈیشن

برائس، جے۔ سی۔ (مرتب) (1985)، لیکچرز آن ریٹورک اینڈ بیل لیٹرز، انڈیانا پولس، انڈیانا: لبرٹی فنڈ۔

کیمبل، آر۔ ایچ۔، اور اے۔ ایس۔ اسکنر (مرتبین) (1982)، این اِنکوائری اِنٹو دی نیچر اینڈ کازز آف دی ویلتھ آف نیشنز، انڈیانا پولس، انڈیانا: لبرٹی فنڈ۔

ہاکونسن، کے۔، اور اے۔ ایس۔ اسکنر (2003)، اِنڈیکس ٹو دی ورکس آف ایڈم اسمتھ، انڈیانا پولس، انڈیانا: لبرٹی فنڈ۔

میک، آر۔ آئی۔، ڈی۔ ڈی۔ رافیل اور پی۔ جی۔ اسٹائن (مرتبین) (1982)، لیکچرز آن جیورسپرڈنس، انڈیانا پولس، انڈیانا: لبرٹی فنڈ۔

موسنر، ای۔ سی۔، اور آئی۔ ایس۔ راس (مرتبین) (1987)، کارسپانڈنس آف ایڈم اسمتھ، نظرِ ثانی شدہ ایڈیشن، انڈیانا پولس، انڈیانا: لبرٹی فنڈ۔

رافیل، ڈی۔ ڈی۔، اور اے۔ ایل۔ میکفی (مرتبین) (1984)، تھیوری آف مورل سینٹیمنٹس، انڈیانا پولس، انڈیانا: لبرٹی فنڈ۔

وائٹ مین، ڈبلیو۔ پی۔ ڈی۔، اور جے۔ سی۔ برائس (مرتبین) (1982)، ایسّیز آن فلاسفیکل سبجیکٹس، انڈیانا پولس، انڈیانا: لبرٹی فنڈ (اس جلد میں ڈوگلڈ اسٹیورٹ کا 'ایڈم اسمتھ ایل ایل ڈی کی زندگی اور تصانیف کا بیان' بھی شامل ہے)۔

اسمتھ کی تصانیف کے دیگر ایڈیشن

ہیگارٹی، جے۔(1976)، دی وِزڈم آف ایڈم اسمتھ، انڈیاناپولس، انڈیانا: لبرٹی فنڈ (اسمتھ کی تصانیف سے منتخب اہم اقتباسات کا مجموعہ)۔

ہائلبرونر، آر۔ایل۔، بمعہ ایل۔جے۔میلُون (1986)، دی ایسینشل ایڈم اسمتھ، آکسفورڈ: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس (اسمتھ کی اہم تحریروں کا مختصر/منتخب ایڈیشن، تعارفی نوٹس کے ساتھ)۔

اسمتھ اور اس کے کام پر کتب

بُوخن، جے۔(2006)، ایڈم اسمتھ اینڈ دی پرسوٹ آف پرفیکٹ لبرٹی، لندن: پروفائل بکس (یہ موقف کہ اسمتھ کے خیالات جدید سیاسی خانوں میں درست طور پر فٹ نہیں ہوتے)۔

کیمبل، آر۔ایچ۔، اور اے۔ایس۔اسکنر (1982)، ایڈم اسمتھ، لندن: کروم ہلم (سوانح، اسمتھ کے بڑے کاموں کے واضح خلاصوں کے ساتھ)۔

فرائی، ایم۔(مرتب) (1992)، ایڈم اسمتھز لیگیسی، لندن: راؤٹلیج (جدید معاشیات میں اسمتھ کا مقام — پال سیموئلسن، فرانکو موڈیگلیانی، جیمز بُکینن اور دیگر نمایاں ماہرینِ معاشیات کی نگاہ سے)۔

کینیڈی، جی۔(2005)، ایڈم اسمتھز لاسٹ لیگیسی، لندن: پیلگریو میکملن (اسمتھ کے اخلاقی فلسفے پر توجہ؛ کینیڈی کے مطابق آج اسمتھ کی اکثر غلط تعبیر کی جاتی ہے)۔

مک لین، آئی۔(2006)، ایڈم اسمتھ: ریڈیکل اینڈ ایگیلٹیریئن، ایڈنبرا: ایڈنبرا یونیورسٹی پریس (عنوان ہی سب کچھ کہہ دیتا ہے)۔

اورورک، پی۔جے۔(2006)، آن دی ویلتھ آف نیشنز، نیویارک: اٹلانٹک منتھلی پریس (مزاحیہ مگر باریک بین خلاصہ، اسمتھ کے بنیادی خیالات کا)۔

رے، جے۔(1895)، لائف آف ایڈم اسمتھ، لندن: میکملن (دلچسپ سوانح؛ 1965 میں جیکب وائنر کے تعارف کے ساتھ دوبارہ شائع بھی ہوئی)۔

راس، آئی۔ ایس۔ (1995(، دی لائف آف ایڈم اسمتھ، آکسفورڈ: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس (ایک ممتاز اسمتھ اسکالر کی تفصیلی سوانح)۔

ویسٹ، ای۔ جی۔ (1976(، ایڈم اسمتھ: دی مین اینڈ ہز ورکس، انڈیاناپولس، انڈیانا: لبرٹی فنڈ (اسمتھ کی زندگی اور خدمات کا بہترین جائزہ)۔

اسمتھ اور اس کے کام پر مضامین

روسٹن، ایل۔ (1970)، 'اے موڈسٹ مین نیمڈ اسمتھ'، کتاب پیپل آئی ہیو لووڈ، نون، اور ایڈمائرڈ میں، نیویارک: مگگرا ہل۔

اسپرَیگ، ای۔ (1967(، 'ایڈم اسمتھ'، پی۔ ایڈورڈز (مرتب(، دی انسائیکلوپیڈیا آف فلاسفی میں، لندن اور نیویارک: کولیئر میکملن (سادہ اور مختصر توضیح، زیادہ تر اسمتھ کے اخلاقی فلسفے پر مرتکز)۔

ڈی وی ڈی

ایڈم اسمتھ اینڈ دی ویلتھ آف نیشنز، انڈیاناپولس، انڈیانا: لبرٹی فنڈ۔

تبصرہ: آدم اسمتھ کی معنویت

کریگ اسمتھ[124]

زیادہ تر لوگوں کے لیے—خصوصاً اسمتھ کے وطن اسکاٹ لینڈ میں—آدم اسمتھ ایک معروف شخصیت ہیں۔ ایڈنبرا میں اُن کے اعزاز میں ایک مجسمہ نصب کیا جارہا ہے، کرنسی نوٹوں پر اُن کی تصویر چھپی ہے، اور اُن کے نام پر ایک کالج اور ایک تھیٹر بھی موجود ہیں۔ میں یہ تحریر بھی یونیورسٹی آف گلاسگو کی آدم اسمتھ بلڈنگ میں اپنے دفتر سے لکھ رہا ہوں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اسمتھ کو پہچانا اور سراہا تو جاتا ہے، مگر اتنے لوگ نہیں جانتے اور نہیں سراہتے کہ وہ حقیقتاً کیا سوچتے تھے۔ اسمتھ اسکاٹ لینڈ، برطانیہ بلکہ یورپ سے ابھرنے والے نہایت گہرے مفکرین میں سے ایک تھے۔ امید ہے کہ یہ آدم اسمتھ پر ائمر عوامی سطح پر پھیلی اس وسیع لاعلمی میں کسی حد تک اصلاح کر سکے گا۔

میرا آدم اسمتھ سے پہلا تعارف ایک باشعور ہائی اسکول کے معاشیات کے استاد کے ذریعے ہوا، جو دی ویلتھ آف نیشنز کی مثالیں استعمال کر کے اسباق کو زندہ بنا دیتے تھے۔ بدھ کے دن چوتھا پیریڈ ایک فکری لطف ہوتا—جس میں پن بنانے والے، مزدوروں کے اونی کوٹ، اور قصاب، شراب بنانے والے اور نانبائی آباد رہتے۔ مجھے خوش قسمتی تھی کہ مجھے اتنی کم عمر میں اس عظیم آدمی کے کام سے واسطہ پڑا—اور اس سے بھی بڑھ کر خوش قسمتی یہ کہ اپنی انڈر گریجویٹ تعلیم کے دوران اسکاٹش روشن خیالی (Scottish Enlightenment) پر ایک کلاس لینے کا موقع ملا۔

بد قسمتی سے اسمتھ کی فکر سے وہ ابتدائی واقفیت، جس سے میں لطف اندوز ہوا، آج بہت کم ملتی ہے۔ آج نہ طلبہ کی کافی تعداد اسمتھ کو پڑھتی ہے، نہ عام قاری۔ ہمارے اسکولوں اور جامعات میں اسمتھ کو اتنی کثرت سے نہیں پڑھایا جاتا جتنا پڑھایا جانا چاہیے۔ یہ بڑی محرومی ہے۔ خاص طور پر یہ افسوس ناک ہے کہ معاشیات کے بہت سے انڈر گریجویٹ طلبہ کو اپنے مضمون کے بانی سے محض سرسری تعارف کرایا جاتا

---

124 تحریر کے وقت، کریگ اسمتھ یونیورسٹی آف گلاسگو کے شعبۂ سیاست میں برٹش اکیڈمی کے پوسٹ ڈاکٹریٹ فیلو تھے۔ اشاعت کے وقت تک وہ یونیورسٹی آف سینٹ اینڈریوز کے شعبۂ اخلاقی فلسفہ میں لیکچرر ہوں گے۔

ہے۔ کئی معاشیات کے کورس اسمتھ کا ذکر (اور عموماً پن بنانے والی مثال) صرف تقسیمِ محنت کے ابتدائی لیکچرز میں مختصراً کرتے ہیں، اور پھر آگے بڑھ کر اُن ہی اصولوں کو خشک اور مجرد اصطلاحات میں بیان کرنے لگتے ہیں جو اسمتھ نے خود شناخت کیے تھے۔

یہ افسوس کی بات ہے، کیونکہ اسمتھ نہایت واضح انداز میں لکھتے ہیں۔ ایسا انداز جو آج بھی اتنا ہی قابلِ فہم ہے جتنا 250 برس پہلے تھا۔ اُن کی تحریریں مشاہدات کا ایک گہرا اور پیچیدہ خزانہ ہیں جو تحریک بھی دے سکتا ہے اور بصیرت بھی۔ اسمتھ کا کام اس کوشش کی نمائندگی کرتا ہے کہ پیچیدہ معاشرے حقیقتاً کیسے کام کرتے ہیں۔ اس سماجی علم کے قلب میں انفرادی تعامل۔(interaction)۔ اور باہمی انحصار (interdepend-ence) کی ایک بنیادی حقیقت کا شعور ہے۔ اور یہ دونوں حقیقتیں آج کی دنیا میں بھی ہمارے سامنے ہیں۔

عالمگیریت (globalisation) کی دنیا میں اسمتھ کا بین الاقوامی اور داخلی تجارت کا مطالعہ اُن قوتوں کے عین مرکز تک پہنچتا ہے جو ہماری زندگیوں کو تشکیل دیتی ہیں۔ وہ اگرچہ ایک مختلف عہد میں لکھ رہے تھے، مگر مرکنٹیلزم کی غلطیوں کی اُن کی تشخیص اور من مانے سیاسی تدخل کے بارے میں اُن کی عمومی بدگمانی آج کے دور میں خاص طور پر موزوں ہے—جب تجارت کو اکثر اُن لوگ آسانی سے شیطانی بنا دیتے ہیں جو تجارت کے مبینہ اثرات کے مخالف ہوتے ہیں۔

اسمتھ کے دانشورانہ حلقوں میں مخالفین بھی کم نہیں۔ مگر وہ ''اسمتھ'' جسے وہ خود غرضی کا نبی سمجھ کر رد کرتے ہیں، اُس اسمتھ سے کوئی واقف نہیں ہو سکتا جس نے حقیقتاً اسمتھ کو پڑھا اور سمجھا ہو۔ تھیوری آف مورل سینٹیمنٹس اخلاقی نفسیات کی ایک نہایت انسانی تصنیف ہے، جو درست طور پر ہمدردی/احساسِ شرکت (empathy) کو انسانی تجربے کے مرکز میں رکھتی ہے۔ اسمتھ نے اپنی بالغ زندگی روزمرہ انسانی تجربے کے مطالعے اور توضیح میں گزاری۔ وہ کامل فضیلت کے ناقابلِ حصول تصورات کے اسیر نہیں تھے۔ اس کے برعکس، اُنہوں نے یہ دیکھا کہ معمول کے لوگ سماجی تعامل کو حقیقتاً کیسے جیتے ہیں، اور اخلاقی فیصلے کیسے کرتے ہیں۔

اور جیسا کہ بعض سطحی ناقدین کہتے ہیں، دی ویلتھ آف نیشنز میں تجارت کے مطالعے اور تھیوری آف مورل سینٹیمنٹس میں ہمدردی کے تجزیے میں کوئی تضاد نہیں۔ دونوں انسانی تجربے کے پہلو ہیں، اور اسمتھ دونوں کے انسانی سماجی زندگی پر اثرات کا جائزہ لینے میں یکساں فکری سختی (conceptual rigour) استعمال کرتے ہیں۔

اسمتھ کا کام انسانی سماجی زندگی کی تجربی حقیقت (empirical reality) کو سمجھنے کی خواہش میں پیوست ہے۔ مثال کے طور پر، ضرورت سے زیادہ سیاسی مداخلت کے خلاف اُن کی دلیلیں تجارتی تبادلے کی حقیقت کے حقائق پر مبنی تجزیے سے نکلتی ہیں۔ یہ بات بھی اکثر نظرانداز ہو جاتی ہے کہ افراد کے درمیان تبادلے کے پیداواری فائدوں کی اُن کی مثالیں انتہائی امیر لوگ نہیں—جن سے وہ اکثر ناگواری ظاہر کرتے ہیں—بلکہ انتہائی غریب لوگ ہیں۔ اسمتھ کا یقین تھا کہ تجارت سب کے لیے فائدہ مند ہے، اور خاص طور پر معاشرے کے بالکل نچلے طبقے کے لیے۔

آدم اسمتھ کا کام ایک آزاد معاشرے کے لیے درکار بنیادی اصولوں اور اداروں کا واضح تجزیہ پیش کرتا ہے۔ قانون کی حکمرانی اور انصاف اُس ''سادہ اور واضح'' نظام فطری آزادی (natural liberty) کا ڈھانچہ فراہم کرتے ہیں جو پوری انسانیت کے لیے سودمند ہے۔ جبکہ مشترک اخلاقی طریقوں کا ارتقا انسانی اجتماعی زندگی کو سہارا دیتا اور قائم رکھتا ہے۔

''غیر مرئی ہاتھ'' کا تصور—یا زیادہ عمومی طور پر غیر ارادی نتائج (unintended consequences) کے ذریعے سماجی ارتقا کا خیال—ہی وہ چیز ہے جو اسمتھ کی جدید دنیا کے لیے سب سے بڑی میراث بنتی ہے۔ یہ پہچان کہ انسانی تاریخ کی بہت سی اہم ترین کامیابیاں—جیسا کہ اسمتھ کے دوست ایڈم فرگوسن نے کہا—انسانی عمل کے نتائج ہوتی ہیں، انسانی منصوبہ بندی کی پیداوار نہیں، ہم سب کے لیے ایک نہایت گہرا سبق ہے۔ یہی مشاہدہ اسمتھ کو اُن ''نظام سازوں (men of system) '' کے بارے میں گہری بدگمانی کی طرف لے جاتا ہے جو بلند مقاصد کے حصول کے لیے انسانیت کو منظم کرنا چاہتے ہیں۔

اسمتھ عملی مزاج اور محتاط انسان تھے، اور اُن کی فکر سیاسی نظریہ ساز کی تکبر آمیز خود اعتمادی کے لیے آسانی سے خام مال فراہم نہیں کرتی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسمتھ کو ایک انقلابی مفکر نہ سمجھا جائے۔ اپنے زمانے میں اُن کے خیالات واقعی انقلابی تھے۔ ہمارے زمانے میں اُن کے خیالات ایک ایسے سیاسی زاویے کی طرف رہنمائی کرتے ہیں جسے سب سے بہتر ''انسان دوست اور لبرل'' کہا جاسکتا ہے۔ وہ آج بھی اس لیے رَیڈیکل ہیں کہ وہ ہمارے سیاسی طبقے کے بہت سے طے شدہ مفروضات کو چیلنج کرتے ہیں۔ شاید اگر ہمارے سیاست دانوں میں سے زیادہ لوگوں نے اسمتھ کو پڑھا اور سمجھا ہوتا تو جو چیز آج رَیڈیکل دکھائی دیتی ہے، وہ اپنی اصل صورت میں حقیقت پسندانہ اور حقائق پر مبنی عام فہم مشورہ نظر آتی۔

اس میں شک نہیں کہ علمی دنیا میں آدم اسمتھ پر تحقیق و تدریس صحت مند حالت میں ہے۔ 2000 سے 2004 کے درمیان دنیا بھر سے چودہ سے زیادہ گریجویٹ طلبہ نے آدم اسمتھ پر پی ایچ ڈی مکمل کیں۔ وہ آدم اسمتھ کے عالمی اسکالرز کی اس برادری میں شامل ہوتے ہیں جو مختلف علمی شعبوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ بین الاقوامی آدم اسمتھ سوسائٹی کی جانب سے سالانہ ایڈم اسمتھ ریویو کی اشاعت بھی اسمتھ کے کام میں علمی دلچسپی کی قوت کا ایک اور ثبوت ہے۔

اسمتھ کے براہِ راست محققین کے علاوہ ایسے اسکالرز کی ایک صحت مند برادری بھی موجود ہے جو اسمتھ سے تحریک پاتی ہے۔ اسمتھ کے مشاہدات سے متاثر ہو کر انہیں اپنی تحقیق کے ذریعے آگے بڑھانے کی بڑی گنجائش ہے۔ اسمتھ کے ''حیرت انگیز طور پر جدید'' نظریۂ علم (theory of science) میں دلچسپی بڑھ رہی ہے، اور اخلاقیات کی اُن کی سماجی نفسیات نئے ذیلی شعبے—ارتقائی نفسیات—(evolutionary psychology) میں تحقیق کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔ زبان اور جمالیات کے بارے میں اُن کے نظریات ابھی کم کھوجے گئے ہیں اور محققین کے لیے زرخیز میدان فراہم کرتے ہیں۔ جیسا کہ ڈاکٹر بٹلر کا پرائمر بخوبی دکھاتا ہے، اسمتھ نے ایک وسیع فکری میراث چھوڑی—مگر ایک نامکمل میراث بھی۔ اسمتھ کی فکر کے مضمرات کو دریافت کرنا ایک بھرپور اور پُرجوش تحقیقی منصوبہ ہے جو زندگی بھر ساتھ چل سکتا ہے۔

آدم اسمتھ نے ہمارے لیے تحریروں کی ایک غیر معمولی طور پر بھرپور وراثت چھوڑی ہے۔ وہ ایسی شخصیت ہیں جنہوں نے آج کی دنیا کی تشکیل میں مدد دی۔ اور وہ ایسی شخصیت بھی ہیں جو ہمیں اسی دنیا کو سمجھنے کے لیے فکری اوزار فراہم کرتی ہے۔ اُن کے کام کو زیادہ وسیع پیمانے پر پڑھا جانا چاہیے اور زیادہ واضح طور پر سمجھا جانا چاہیے۔ اگر ایسا ہو جائے تو اُن کے خیالات کی ترغیبی قوت ہماری دنیا کو بھی روشن کر سکتی ہے—جیسے اُن کی بصیرتوں نے اُن کے اپنے عہد کو روشن کیا تھا۔

House 1, Street 58, F-7/4,
Islamabad Capital Territory 44000
Tel: +92 (51) 831 4338
www.primeinstitute.org